ربندرناتھ ٹھاکر

حیات و خدمات

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

۱۷۔ سنڈری موہن ایونیو، کلکتہ ۷۰۰۰۱۴

سالِ اشاعت ــــــــ ۱۹۹۰ء

تعدادِ اشاعت ــــــ پانچ سو

مطبع : دی اعجاز پرنٹرز
۱۸۔ زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

قیمت ۳۰ روپے
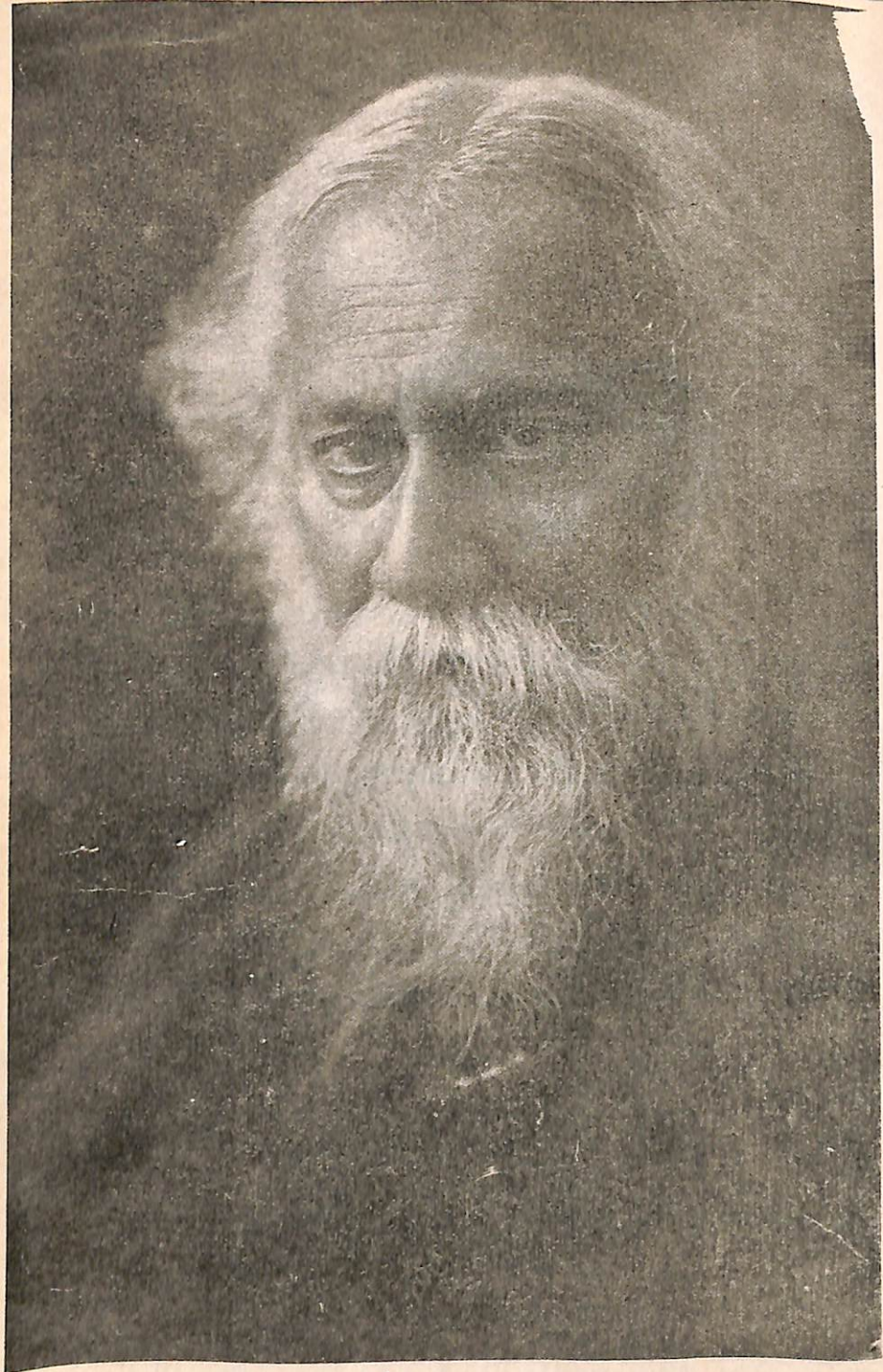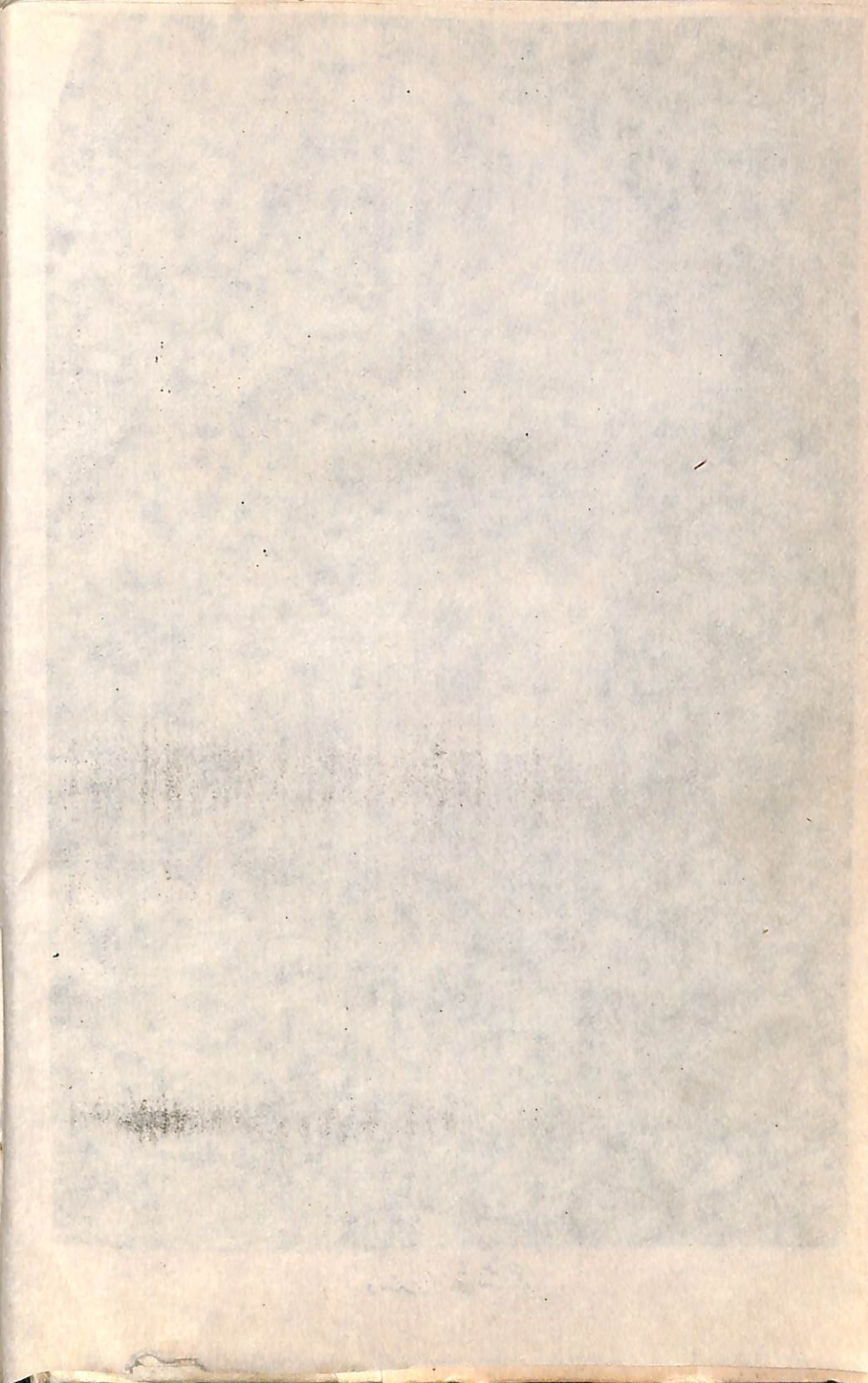
رابندر ناتھ ٹیگور

بنگلہ ادب کے عظیم المرتبت ادیب، شاعر و فنکار — رابندر ناتھ ٹھاکر پر دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اردو میں ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے جن سے رابندر ناتھ ٹھاکر کو سمجھنے میں مدد ملے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ کوئی ایسی کتاب شائع کرے جس سے بنگال کے اس عظیم سپوت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی شروع ہی سے اس بات کی کوشاں ہے کہ بنگلہ اور اردو زبانیں بولنے والوں کے درمیان رابطہ قائم ہو اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے راہ ہموار ہو۔ اس سلسلے میں متعدد کتابیں شائع کی جا چکی ہیں اور اب آپ کے ہاتھوں میں ہماری نئی کتاب "رابندر ناتھ ٹھاکر — حیات و خدمات" ہے ہمیں اپنی قیمتی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

محمد فخر الدین
سکریٹری

ঈশ্বরচন্দ্র বিদ্যাসাগর

বঙ্গসাহিত্যের রাত্রি স্তব্ধ ছিল তন্দ্রার আবেশে
অখ্যাত জড়ত্বভারে অভিভূত। কী পুণ্য নিমেষে
তব শুভ অভ্যুদয়ে বিকীরিল প্রদীপ্ত প্রতিভা,
প্রথম আশার রশ্মি নিয়ে এল প্রত্যুষের বিভা,
বঙ্গভারতীর ভালে পরাল প্রথম জয়টিকা।
রুদ্ধভাষা আঁধারের খুলিলে নিবিড় যবনিকা,
হে বিদ্যাসাগর, পূর্ব দিগন্তের বন উপবনে
নব উদ্বোধনগাথা উচ্ছ্বসিল বিস্মিত গগনে।
যে বাণী আনিলে বহি নিষ্কলুষ তাহা শুভ্ররুচি,
সকরুণ মাহাত্ম্যের পুণ্য গঙ্গাস্নানে তাহা শুচি।
ভাষার প্রাঙ্গণে তব আমি কবি তোমারি অতিথি;
ভারতীর পূজাতরে চয়ন করেছি আমি গীতি
সেই তরুতল হতে যা তোমার প্রসাদ সিঞ্চনে
মরুর পাষাণ ভেদি' প্রকাশ পেয়েছে শুভক্ষণে ॥

২৪ ভাদ্র
১৩৪৫

রবীন্দ্রনাথ ঠাকুর

فہرست

۱۔	ابتدا	
۲۔	خاندانی لقب ٹھاکر کی کہانی	۱۵
۳۔	دوار کا ناتھ ٹھاکر	۲۱
۴۔	مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر	۲۵
۵۔	رابندر ناتھ ٹھاکر	۳۳
۶۔	شجرہ خاندان	۵۰
۷۔	تصانیف رابندر ناتھ ٹھاکر	۵۳
۸۔	ٹھاکر گھرانے کا ماحول اور اس دور کا سماج	۶۱
۹۔	گیتانجلی اور نوبل انعام	۶۹
۱۰۔	"سر" کا خطاب پانا اور لوٹا دینا	۸۱
۱۱۔	کسان مزدور اور شاعر	۹۳
۱۲۔	زبان اور تعلیم کے مسائل	۱۱۳
۱۳۔	مذہب اور فرقہ پرستی کے مسائل	۱۳۱

۱۴۔ روس کے خطوط	۱۴۹
۱۵۔ امن عالم کا ساتھی، سامراج اور فاشسٹ دشمن۔ ـــــــ رابندر ناتھ	۱۶۱
۱۶۔ ربندر ناتھ کی تخلیقات پر ایک نظر	
۱۔ شاعری	۱۷۵
۲۔ موسیقی اور گیت	۱۸۵
۳۔ افسانے اور ناول	۱۹۵
۴۔ ڈرامے	۲۰۷
۵۔ مصوّری	۲۱۵
۱۷۔ اردو دانشوروں سے ٹھاکر کے تعلقات اور اردو ادب پر ٹھاکر کے اثرات	۲۲۷
۱۸۔ کتابیات	۲۵۳

ہندوستان کی علمی وادبی زبانوں میں اردو کو کم عمری کے باوجود ممتاز مقام اور بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اس لیئے یہ کہنا درست نہیں کہ اردو میں ربندرناتھ ٹھاکر کی زندگی پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اُن کی کئی تخلیقات کا اردو ترجمہ (عموماً انگریزی سے) بار بار منظرِ عام پر آچکا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو میں حیات ٹھاکر پر کوئی تفصیلی، صحیح اور مستند کتاب ہنوز لکھی نہ جاسکی اور جو چند کتابیں ملتی ہیں وہ ضخامت کے لحاظ سے کتابچے ہیں جن میں ان کی تخلیقات پر تنقیدی روشنی نہیں ڈالی گئی بلکہ ربندرناتھ کی ہمہ گیر شخصیت کا ہر پہلو سے جائزہ لینا تو درکنار ان کی علمی، ادبی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی خدمات سے سیر حاصل بحث بھی نہیں ہوئی ہے۔ اردو میں حیاتِ ٹھاکر پر جو تصانیف دستیاب ہیں ان کے مصنفین نے انگریزی زبان واملا کا اثر قبول کیا ہے لہٰذا وہ عموماً مختلف مقامات، تصانیف اور افراد کے نام بنگلہ تلفظ کے مطابق نہیں لکھتے ہیں اور تقریباً نصف صدی پہلے بہ نسبت اصل غلطیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آج تک جاری ہے حتّٰی کہ ربندرناتھ ٹھاکر کا نام (انگریزی کے اثر سے) بیشتر تصانیف میں رابندرناتھ درج ملتا ہے اور بعض نے "رابندراناتھ" لکھا اور کبھی کسی نے "رابنڈرناتھ" تک لکھ دیا ہے۔ خاندانی لقب ٹھاکر بھی عام طور پر "ٹیگور" لکھا گیا ہے اور پھر ایک آدھ نے "ٹگور" یا "ٹاگور" لکھا ہے۔

لہ میں نے اردو تصانیف سے اقتباسات نقل کرتے ہوئے ٹیگور کی بجائے "ٹھاکر" لکھا ہے تاکہ نام کا صحیح تلفظ ہر جگہ برقرار رہے۔

اردو میں ربندر ناتھ پر سب سے پہلی کتاب مخدوم محی الدین کی "ٹیگور اور ان کی شاعری"
ہے جو ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے دیباچہ کے ساتھ شائع
ہوئی۔ اس کے بعد کی چند تصانیف حسب ذیل ہیں۔
(۱) ٹیگور از نادم سیتاپوری (۲) رابندر ناتھ ٹیگور از وزیر حسن دہلوی (۳) عالمی
شاعر یعنی گرودیو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی جیون کہانی از ایم عبدالسلام ذکی (۴) شری رابندر
ناتھ ٹیگور از احسان بی اے وغیرہ۔ ان لکھنے والوں میں کوئی بھی بنگلہ زبان سے واقف نہ تھا
لہٰذا ہر ایک نے انگریزی تصانیف کی مدد سے اپنی تصنیف کو مکمل کیا ہے۔ (یہی نہیں بلکہ
اردو میں ربندر ناتھ کی تخلیقات کے جو ترجمے ہوئے ہیں وہ بھی بنگلہ سے نہیں کیے گئے لہٰذا
کمزوریوں سے وہ بھی پاک نہیں ہیں)۔ ان تصانیف میں نہ صرف کئی غلط باتیں راہ پا گئی ہیں بلکہ
انگریزی سے ترجمہ کرنے کی وجہ سے بیشتر اسم خاص کچھ سے کچھ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً مقام شانتی
نکیتن کو کسی نے شنتی کتن، کسی نے سنتنی گتن اور کسی نے شانتی نکیتان لکھا ہے۔ مقام شلائی
داہ" کو کسی نے "شیلدہ"، کسی نے "شیلیدہ"، کسی نے "سلائی دھا" اور کئی ایک نے "شلیدان"
بھی لکھا ہے۔ چندن نگر کو چندر ناگور اور بولپور کو بالپور لکھا گیا ہے۔ ڈرامہ "چترانگدا" کو
عبدالسلام ذکی صاحب نے "چترا گندھا" لکھ دیا ہے اور وہ مشہور بنگلہ ماہنامہ جس میں ربندر
ناتھ کی کئی تخلیقات چھپتی رہی ہیں یعنی "پرباسی" کو مخدوم نے ہر جگہ "پراباسی" اور کئی حضرات
نے "پرواشی" لکھا ہے۔ وزیر حسن دہلوی نے ناول نگار بنکیم (چندر چٹرجی) کو "بنکم" لکھا تو مخدوم
محی الدین نے "بیانکم"۔ اسی طرح مخدوم اور نادم سیتاپوری نے اشتوتش مکرجی کا نام (انگریزی
کے مطابق) "اسوٹاس مکرجی" لکھا ہے۔ غرض ربندر ناتھ ٹھاکر کی حیات و خدمات پر ایک
اچھی تصنیف کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے
اس کام کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے اور میں نے اسے نبھانے کی کوشش کی ہے، اس میں راقم کہاں
تک کامیاب ہو سکا ہے اس کا فیصلہ کرنا اہل علم و قلم کا کام ہے۔
شیکسپیئر (Shakesphere) پر اظہار خیال کرتے ہوئے ٹی ایس
ایلیٹ نے لکھا ہے

"شیکسپیئر کے ڈراموں پر تنقید کی تاریخ میں ترقی

ہوئی ہے، لیکن یہ ترقی ممکن ہوسکی ہے درست نسخوں کی اشاعت
اور ساتھ ہی اس عہد کے اسٹیج کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی جانکاری
کی وجہ سے۔ خود شیکسپیئر کے حالاتِ زندگی اور پھر اس زمانے
کے حالات کا زیادہ سے زیادہ علم ہونے سے۔ جوں جوں دنیا
بدلے گی شیکسپیئر پر تنقید میں تبدیلیاں ہوں گی۔ درست
جائزہ لینے کے لئے اس عہد کا سماجی ماحول اور ان حالات کا کم
و بیش علم یقیناً ہونا چاہیئے جن حالات کے تحت وہ تخلیقات
عالمِ وجود میں آئی ہیں۔"

یہی الفاظ ربندر ناتھ ٹھاکر کے سلسلے میں بھی صد فی صد درست ہیں۔ جب تک اس دور کے حالات کا، اس سماج اور ماحول کا صحیح علم نہ ہو جس عہد، سماج اور ماحول میں ربندر ناتھ پلے اور بڑھے تب تک ان کی تخلیقات اور خدمات کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ ربندر ناتھ کی تخلیقات اور خدمات پر آج سرے سے بدلے ہوئے حالات کے تحت غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے اور تب ہی ہم یہ فیصلہ کر پائیں گے کہ انھوں نے زندگی بھر اپنے وطن اور ساتھ ہی پوری دنیا اور انسانیت کی کتنی عظیم خدمت انجام دی ہے اور ہمیں وہ کہاں سے کہاں تک لے آئے ہیں۔ دنیا کی نظروں میں ہم ہندوستانی کیا تھے اور انہوں نے ہمیں کس بلندی اور باعزت مقام پر پہنچا دیا ہے۔ پھر یہ بھی کہ آج ان کی تخلیقات کی قدر و قیمت کیا ہے؟ وہ کون سی باتیں ہیں جن پر آج ہمیں غور کرنی چاہیئے جو آج ہمارے لئے مفید ہیں؟ ربندر ناتھ کا ازِ سرِ نو مطالعہ کیوں کیا جائے؟ ربندر ناتھ نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے۔ وہ بخوبی آگاہ تھے کہ ان کی تمام تخلیقات مستقبل میں زندہ نہیں رہیں گی۔ انہوں نے نظم "پران" میں اس خیال کو صاف طور پر پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ زندگی کے خواہاں ہیں اور عوام کے دلوں میں زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اسی لئے وہ انسانی دکھ سُکھ کے گیت گاتے ہیں اور نظم کے آخر میں کہتے ہیں ؎

میں صبح شام
تمہارے لئے
گیتوں کے نئے نئے پھول کھلاتا ہوں!

تم ـــ خوشی سے ان پھولوں کو قبول کرلو
لیکن ـــ اگر بعد میں
یہ پھول مُرجھا جائیں ـــ تو
ان پھولوں کو پھینک دینا ـــ !!

رابندر ناتھ سے پہلے بنگلہ زبان اور اس کے ادب نے کتنی ترقی کی تھی اور بحیثیت ایک فنکار کے ٹھاکر نے بنگلہ زبان کو کیا دیا۔ ان کا انداز بیان، خیال کی بھرپور ادائیگی کے لئے موزوں ترین الفاظ کا انتخاب' اسلوب اور ادبی تکنک میں نت نئے تجربے، کلام کی رنگینی، شیرینی، سوز و گداز اور موضوع کے اعتبار سے وقتِ ضرورت لہجے کی تبدیلی، شدّت، جوشِ کلام وغیرہ پر کچھ کہنا یہاں بیکار ہے چونکہ ان چیزوں کا تعلق ایک مخصوص زبان سے ہے جو شاعر کی اپنی زبان رہی ہے۔ دیگر زبان والوں کے لئے اس کا ذکر بے معنی ہے اور نہ ہی ترجمے سے ان ادبی خصوصیات کو اجاگر کیا جا سکتا ہے لہٰذا ایسے موضوعات کو چھیڑنے کی میں نے کوشش نہیں کی ہے لیکن ادب کا گہرا تعلق انسانی زندگی سے ہے، سماج سے ہے۔ فنکار ایک سماجی فرد اور باشعور ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، مسائل پر غور و فکر کرتا ہے اور نتیجۂ فکر کو فنی طور پر ادب میں پیش کرتا ہے۔ رابندر ناتھ نے اپنے دور کے ہر اہم موضوع کو چھیڑا اور کئی میدانوں میں عملی طور پر حصہ بھی لیا۔ یعنی وہ محض گفتار کے غازی نہیں بنے رہے۔

رابندر ناتھ کی بہت سی تخلیقات آج بھی تر و تازہ شگوفے ہیں جن کی خوشبو دل و دماغ کے لئے فرحت بخش ہے جن میں زندگی کا بھرپور رس ہے اور جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں لہٰذا میں آج کے حالات کے تحت رابندر ناتھ کی زندگی کے ان ہی موضوعات کو چھیڑنے اور ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں جو مسائل آج بھی غور طلب ہیں۔ یعنی جن پھولوں میں آج بھی خوشبو ہے۔ لیکن اس کام سے پہلے رابندر ناتھ ٹھاکر کا گھرانہ اور گھریلو ماحول کا سرسری علم ہونا ضروری ہے تاکہ ہم رابندر ناتھ کے کردار کی تعمیر کا پس منظر جان لیں۔

خاندانی لقب "ٹھاکر" کی کہانی

عموماً اردو لغات میں "ٹھاکر" کو ہندی کا لفظ قرار دیا گیا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ بنیادی طور پر ٹھاکر آسٹرک (کول) خاندان کا لفظ ہے۔ (غیر آریائی لفظ) یعنی سنتالی یا سنتھالی زبان سے یہ دیگر ہندستانی زبانوں میں آیا ہے۔ سنتالی میں ٹھاکر کے معنی "بڑا دیوتا" ہے یہی وجہ ہے کہ ہندستانی زبانوں میں لفظ "ٹھاکر" کا استعمال بمعنی دیوتا، ایشور، بھگوان یا خدا کے ہوا اور بعد میں اس کا استعمال "برہمن" کے لئے بھی رواج پایا۔ چونکہ ہندو سماج میں برہمن ہی پوجا پاٹ کا کام کرتے ہیں پھر بنگالہ (بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ) کے پورے علاقے میں باورچی (پکوان کا کام کرنے والے) بھی ٹھاکر کہے جانے لگے۔ قدیم ہندو سماج (اور آج بھی بہت بڑی حد تک) میں چھوت چھات عام تھی اور لوگ کسی نچلی ذات کے ہاتھ کا پکایا ہوا نہیں کھاتے تھے لہٰذا برہمن ہی پکانے کا کام کرتے تھے۔ اس طرح پکوان کا کام کرنے والے بھی "ٹھاکر" کہے جانے لگے اور آج پورے بنگال میں پکوان کا کام عموماً اڑیسہ کے برہمن کرتے ہیں اور یہ لوگ عام طور پر "ٹھاکر" کہے جاتے ہیں۔

عموماً "ٹھاکر گھرانے والے" ان کو سمجھا جاتا ہے جن کے نام کے آخر میں لفظ "ٹھاکر" ہوتا ہے حالانکہ یہ صرف ایک گھریلو لقب (Title) ہے جبکہ اس گھر کے افراد ایسے بھی ہیں جو "ٹھاکر" نہیں کہلاتے یا جو اپنے نام کے ساتھ "ٹھاکر" لقب کا استعمال نہیں کرتے۔ ٹھاکر لقب کی ابتدائی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ لیکن آج ٹیگور کا جو لفظ مشہور ہوگیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز "ٹھاکر" تلفظ نہیں ادا کرپاتے تھے اور وہ اسے ٹگور، ٹاگور یا ٹگور کہتے جس کا انگریزی املا Tagore اور Tagaure ہے۔ اس طرح ٹھاکر بگڑ کر آخر کار ٹیگور ہوا اور بنگلہ کے علاوہ دیگر زبان والے ٹیگور کہنے لگے کیونکہ انہوں نے انگریزی زبان کے سہارے شاعر کو جانا۔ لفظ ٹھاکر

کی ابتدائی داستان جو مشہور ہوئی وہ یوں ہے۔

۱۴۹۴ء میں کھانار ضلع راجشاہی میں رام چندر مسر پیدا ہوئے۔ وہ غریب تھے۔ ان کے تین بیٹے گوپی ولو مسر، موہن مسر اور وشوا ناتھ مسر تھے۔ تینوں بھائیوں میں منجھلے بھائی موہن مسر نامور ہوئے۔ انہوں نے سنسکرت ادب کا گہرا مطالعہ کیا جس کی وجہ سے ان کے دھارمک (مذہبی) خیالات میں گہرائی آگئی۔ وہ گھر بار چھوڑ کر سادھو بن کر نکل گئے کئی سال سادھو بن کر مختلف مقامات کا سفر کرنے کے بعد وہ پاکوریا ضلع بردوان (مغربی بنگال) میں آکر مقیم ہوئے۔ رفتہ رفتہ اطراف کے دیہاتوں میں یہ بات پھیل گئی کہ پاکوریا میں ایک سادھو مہاراج آئے ہوئے ہیں۔ پھر لوگ درشن کے لئے آنے لگے۔ راجا گنگس نارائن (غالباً یہ کوئی بڑے زمیندار تھے) بھی ان کے چیلے ہوئے اور بھوانی دیوی (جو غالباً راجا کی بیٹی یا بہن تھی) سے موہن مسر کی شادی رچا کر راجا نے موہن مسر کو اپنا رشتہ دار بنا لیا۔ شادی کے بعد موہن مسر پھر سے پاکوریا میں آبسے۔ یہاں کئی لوگ ان کے چیلے ہوگئے۔ گرو کے لئے لفظ "ٹھاکور" یا "ٹھاکر" کا عام (بنگلہ اور ساتھ ہی دیگر کئی ہندستانی زبانوں میں) استعمال ہے اور چونکہ موہن مسر "ٹھاکر" مشہور ہوئے اس لئے لفظ ٹھاکر کا استعمال کیا جانے لگا۔ موہن مسر کے دوسرے اور تیسرے بیٹے یعنی شری گربھ اور کاشی ناتھ (جن دونوں نے اپنے والد بزرگوار کے چیلوں کو سنبھالنے کا کام اپنے ذمہ لیا تھا) بھی ٹھاکر کہلائے اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھا۔

شری پربھات کمار مکھوپادھیائے نے ربندر ناتھ ٹھاکر کے خاندان کے سلسلے میں لکھا ہے[1] کہ وہ گھرانہ جس سے ربندر ناتھ کا تعلق ہے سب سے پہلے جگن ناتھ کو شاری نامور ہوئے۔ اس نے پیرالی برہمن سُکھ دیب رائے چودھری کی ایک بیٹی سے شادی کی اور موضع دکھن ڈھی ضلع کھلنا میں جا بسا۔ لہٰذا یہ ٹھاکر گھرانہ پیرالی ہوگیا۔ جگن ناتھ کے تین چار نسل بعد پنچانن اور اس کے چچا سکھ دیب کشتی میں سفر کرکے کلکتہ آئے۔ پنچانن کے بیٹے جے رام نے انگریزی کمپنی میں ملازمت (امینی) کرکے خوب روپیہ کمایا۔ اس کے چار بیٹوں میں نیل منی اور درپ نارائن محلہ جوڑا سانکو اور پاتھوریا گھاٹ (کلکتہ) کے اولین افراد ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو صوبہ بنگالہ کی دیوانی (۱۷۶۵ء) ملنے کے بعد نیل منی، اڑیسہ میں دفتر کلکٹری میں ملازم ہوئے اور انہوں نے کافی دولت کمائی۔ اس طرح یہ

---

[1] ربندر جیون کتھا۔ پربھات کمار مکھوپادھیائے، آنند پبلشرز، کلکتہ ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳

پیرالی[1] گھرانہ رئیس ہوا۔ بہرحال پیرالی برہمن ہی کیوں نہ ہوں۔ اس گھرانے کے افراد برہمن تو تھے ہی۔ محلہ جوڑاساکو میں ان دنوں زیادہ تر غریب ہندو آباد تھے اور ان میں برہمن نہیں تھے۔ یعنی یہ نچلی ذات کے ہندوؤں کا محلہ تھا اس لئے اس محلہ کے لوگ پیرالی برہمن پاکر بھی بہت خوش ہوئے اور اس گھر کے لوگوں کو "ٹھاکر" کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ انگریزوں سے تجارتی تعلقات ہونے کی وجہ سے انگریز بھی اس محلے کے لوگوں کی طرح اس خاندان کے افراد کو "ٹھاکر" (انگریزی تلفظ کے اعتبار سے "ٹیگور" یا "ٹگور") کہتے اور ہوتے ہوتے یہی جوڑاساکو کے پیرالی برہمن گھرانے کا خاندانی لقب بن گیا۔ وارن ہسٹنگز کے دور حکومت میں نیل منی ٹھاکر نے جوڑاساکو (کلکتہ) میں گھر بنا لیا۔ ان دنوں یہ پورا علاقہ "مچھوا بازار" کہلاتا تھا اور آج بھی اس علاقے کا ایک بڑا حصہ اسی نام سے مشہور ہے لیکن جس جگہ ٹھاکر گھرانے کے مکانات ہیں وہ علاقہ (محلہ) جوڑاساکو یا جوڑاسانکو کہلاتا ہے۔ "ساکو" یا "سانکو" بانس سے بنے ہوئے چھوٹے پل کو کہا جاتا ہے۔ اس نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ برسات میں پانی سے جل تھل ہو جاتا تھا اور یہاں دو بانس کے پل بنے ہوئے تھے جس پر سے لوگ آتے جاتے تھے اور ان دو بانس کے پلوں کی وجہ سے اس علاقے کا نام جوڑاساکو پڑ گیا۔

مختصر یہ کہ اسی نیل منی ٹھاکر[2] سے ربندر ناتھ کے گھرانے کا عروج شروع ہوا۔ ربندر ناتھ سے پہلے اس گھر کے جو لوگ نامور ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

---

[1] پیرالی برہمن وہ ہیں جو قدیم زمانے میں کسی وجہ سے اونچی ذات کے برہمن گھرانے سے نکال باہر کئے گئے تھے۔ یاد رہے کہ اس گھرانے کے اولین افراد بندوپادھیائے برہمن تھے اور گوتر "سنڈلیہ" تھا اور جگن ناتھ کو شادی سے یہ گھرانہ پیرالی ہو گیا۔ عام طور پر بنگال میں ترکوں اور پٹھانوں کے دور حکومت میں جو برہمن لوگ ان حکمرانوں یا ان کے مذہب والوں (مسلمانوں) سے تعلقات رکھتے تھے وہ ذات باہر قرار دے دئے جاتے تھے۔ ایسے ذات باہر برہمن "پیرالی" کہے جاتے۔ ربندر ناتھ کا گھرانہ بھی پیرالی برہمن گھرانہ تھا۔ [2] اس سلسلے میں یاد رہے کہ آج کل جس طرح ہندو بنگالی اپنے نام کے ساتھ آخر میں خاندانی القاب کا استعمال ضرور کرتے ہیں آج سے کوئی دو سال قبل ایسے القاب استعمال نہیں کئے جاتے تھے۔ وہ صرف اپنا نام لکھتے تھے اور چند نہایت ہی مشہور لوگ جن کو کسی خاص وجہ سے شاہی دربار وغیرہ سے کوئی لقب ملتا (مثلاً زمینداری یا شاہی ملازمت کی وجہ سے) وہی لوگ نام کے ساتھ لقب کا استعمال کرتے تھے اور ایسے القاب بھی بعد میں خاندانی القاب بن گئے۔ لیکن اب تو "رائے"، "چودھری" یا "رائے چودھری" (باقی اگلے صفحہ پر)

دوارکاناتھ ٹیگور ـــــــ دادا

دوارکا ناتھ ٹھاکر

ولادت ۱۷۹۴ء، وفات ۱۸۴۶ء۔ ولد رام منی۔ آپ ربندر ناتھ کے دادا تھے۔ زمانہ کے رواج کے مطابق آپ نے گھر پر فارسی پڑھی اور اسکول میں انگریزی۔ خاندانی جائیداد کے علاوہ آپ نے ملازمت اور تجارت سے کروڑوں روپیہ کمایا اور اپنے وقت کے نامور رئیس ہوئے۔ آپ کی شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور چال چلن کی وجہ سے آپ "پرنس" کہلائے۔ ۱۸۲۳ء میں آپ ضلع ۲۴ پرگنہ کے کلکٹر (نمک محل) اور دیوان ہوئے۔ چھ سال کے بعد آپ نمک اور افیون بورڈ کے دیوان ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ نے ذاتی تجارت شروع کی۔ وہ ہندستان میں جدید تجارت اور صنعت کے بانی ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں آپ نے یونین بینک کے نام سے ایک بینک قائم کیا تھا جو کسی ہندستانی کا قائم کیا ہوا پہلا بینک رہا ہے۔ آپنے چند انشورنس کمپنیاں بھی کھولی تھیں۔ اپنی ذاتی تجارت کی ترقی کی وجہ سے ۱۸۳۴ء میں آپ نے انگریزوں کی ملازمت ترک کردی اور "کار اینڈ ٹیگور کمپنی" کے نام سے ایک تجارتی فرم قائم کرکے صنعت وتجارت کی ترقی میں لگ گئے۔ ریشم، نیل، کوئلہ کے کان، شکر کارخانہ اور جہازی تجارت کو فروغ دیا۔ آپ کئی جہازوں کے مالک تھے جن میں سے چند مسافروں کے سفر کے لئے بھی تھے اور ان میں سے ایک جہاز کا نام "دوارکا" تھا۔ آپ ہندستان میں شکر کارخانہ کے بانی ہیں۔ بھاپ سے چلنے والی مشینوں سے کارخانہ قائم کرنے والے پہلے ہندستانی بھی آپ ہی ہیں۔ ۱۸۴۲ء میں پہلی بار آپ تجارت کے سلسلے میں ولایت گئے اور وہاں

(بقیہ اگلے صفحہ کا) کا بیٹا "رائے چودھری" ہے، چاہے وہ زمین جائیداد کا مالک ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح "بھٹاچاریہ" کا بیٹا "بھٹاچاریہ" ہے، چاہے وہ پوجا پاٹ نہ جانتا ہو۔

۱۶/ جون کو مہارانی وکٹوریہ سے ملاقات کی اور مہارانی نے آپ کو دعوت دی تھی۔ یہ ایک ہندستانی کے لئے سب سے بڑا اعزاز تھا۔ ۱۸۴۵ء میں آپ دوسری بار ولایت گئے اور اس سفر کے دوران لندن میں یکم اگست ۱۸۴۶ء کو انتقال کر گئے۔

پرنس دوارکاناتھ نے لاکھوں روپیہ عوامی فلاح وبہبود کے کاموں میں صرف کیا۔ ڈسٹرکٹ چاریٹیبل سوسائٹی کو آپ نے لاکھوں روپیہ عطیہ دیا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں آپ نے پبلک لائبریری قائم کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ دوسری بار جب آپ ولایت گئے (مارچ ۱۸۴۵ء) تب چار ہندستانی میڈیکل طلبہ کو اعلیٰ میڈیکل تعلیم دلانے کے لئے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان میں سے دو یعنی ڈاکٹر بھولاناتھ بوس اور ڈاکٹر گوپال لال شیل (جو بعد میں نامور ڈاکٹر ہوئے) نے آپ کی مالی امداد سے ولایت میں میڈیکل تعلیم مکمل کی تھی۔

دوارکاناتھ، راجہ رام موہن رائے کے گہرے ساتھیوں میں سے تھے (حالانکہ وہ خود برہمو سماجی نہیں ہوئے تھے)۔ ستی کی رسم رد کرنے کے لئے رام موہن رائے نے جو اپیل لارڈ ولیم بنٹنک کو پیش کی تھی اس پر دستخط کرنے والوں میں آپ بھی شامل رہے ہیں۔ آپ عموماً فارسی میں دستخط کرتے تھے۔ آپ کا گہرا تعلق صحافت سے بھی تھا۔ آپ ہفتہ وار "بنگال ہرکارہ"، "بنگال ہیرالڈ" اور "بنگ دوت" کے مالکان میں سے رہے ہیں۔ "انگلش مین" اخبار کو بھی آپ نے مالی امداد دی تھی۔ ہفتہ وار "بنگ دوت" بنگلہ، فارسی اور "بنگال ہیرالڈ" انگریزی، بنگلہ، فارسی اور ہندی زبانوں میں نکلا کرتا تھا۔ ان اخبارات میں حصہ لینے سے صاف ظاہر ہے کہ آپ فارسی بخوبی جانتے تھے۔ مورخہ ۷/ جولائی ۱۸۳۵ء کے بنگلہ ہفت روزہ "سماچار درپن" میں ضلع جیسور کے ایک باشندے کا طویل مراسلہ فارسی کی حمایت میں شائع ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے لکھا کہ ——

"کلکتہ میں مرحوم بابو گوپی موہن ٹھاکر کا گھرانہ اس سلسلے میں (فارسی دانی) مشہور ہے لیکن بابو نند لال ٹھاکر کے بعد اس خاندان پر نئی روشنی کی کرنیں پڑنے لگیں اور وہ نئی روشنی سے متاثر ہو گئے۔ اس کے باوجود دوارکاناتھ ٹھاکر فارسی سے واقف تھے کیونکہ ۲۴ پرگنہ کی کلکٹری میں آپ سررشتہ دار تھے اور آپ فارسی ہی میں دستخط کیا کرتے تھے۔"

مہارشی دیبندر ناتھ ——— والد
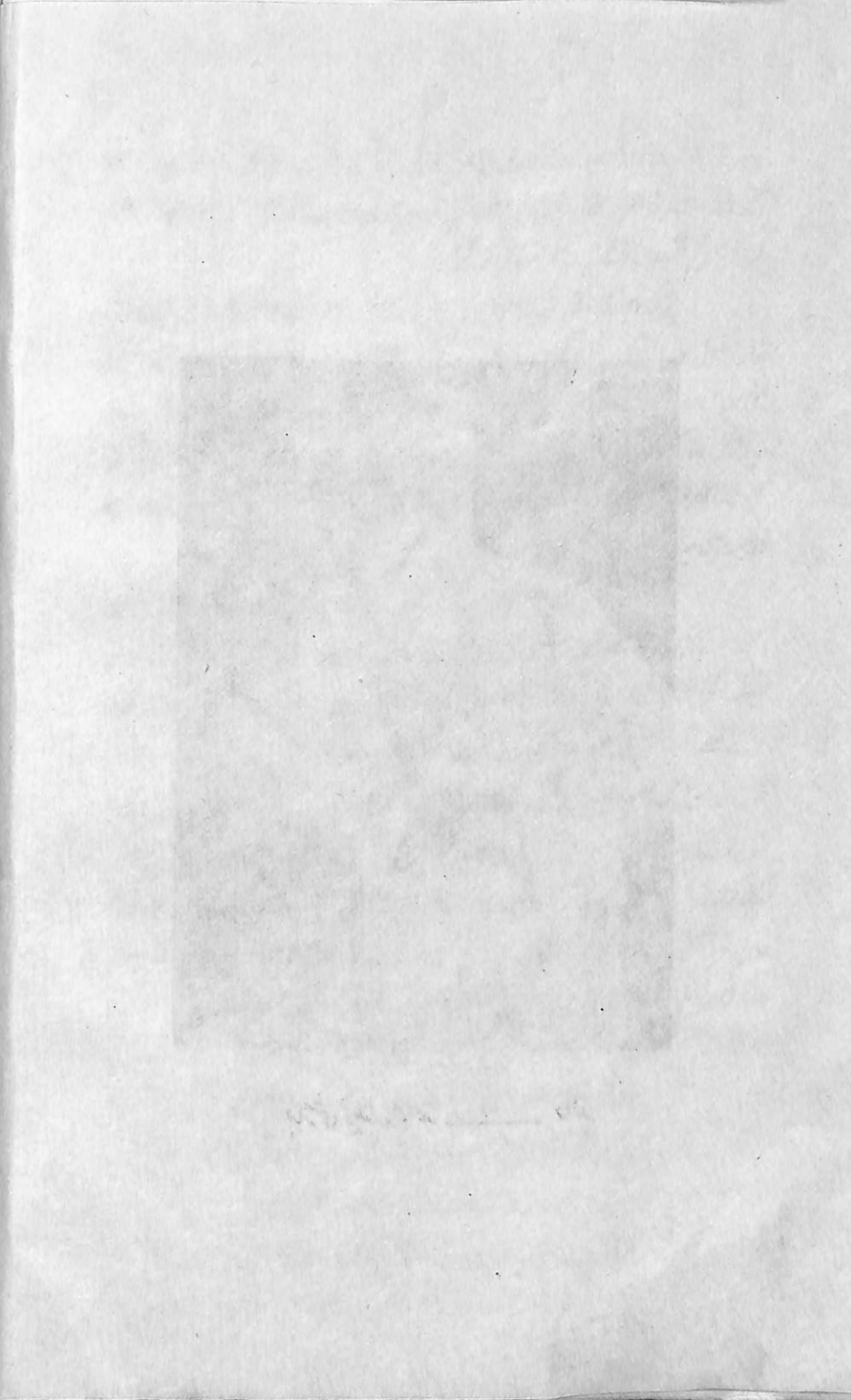
مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر

ولادت ۵ مئی ۱۸۱۷ء بمقام جوڑاساکو، کلکتہ۔ ولد پرنس دوارکاناتھ ٹھاکر۔ آپ شاعر جہاں ربندر ناتھ ٹھاکر کے والد بزرگوار تھے۔ نواب سید نصیر حسین خاں خیال نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[1] ـــــــــ

"مشہور ٹھاکر خاندان نے بھی فارسی اور اردو کی خدمت کی۔ ڈاکٹر ربندر ناتھ ٹھاکر طوطیٔ بنگال کے والد فارسی اور اردو کے ماہر سمجھے گئے۔ حافظ کے وہ حافظ تھے اور کہا جاتا ہے کہ ٹھاکر کی شاعری میں اسی لئے فارسی کا مذاق موجود ہے اور حافظ کے فلسفے کی جھلک نظر آتی ہے۔"

اسی طرح کے خیالات کا اظہار چند اور اہل قلم حضرات نے بھی کیا ہے مثلاً نادم سیتاپوری لکھتے ہیں[2] ـــــــــ

"مہارشی دویندرناتھ اپنے زمانے کے ایک مشہور عالم تھے۔ ادب، فنون لطیفہ، فلسفہ، ہیئت، انسانیت اور اسلامی ادب اُن کے خاص موضوع تھے۔ بنگالی، سنسکرت اور ہندی کے ساتھ ساتھ انہیں اردو اور فارسی زبانوں پر بھی عالمانہ عبور حاصل

---

[1] مغل اور اردو۔ نواب سید نصیر حسین خاں خیال، پبلشر شائق احمد اینڈ سنس، کلکتہ، مئی ۱۹۳۳ء

[2] ٹیگور۔ نادم سیتاپوری۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵

تھا۔ مثنوی مولانا رومؒ اور حافظ شیرازی کے صوفیانہ کلام سے انہیں
ایک خاص قسم کا عشق تھا۔ عرفان و معرفت کی تلاش میں ہمالیہ کی بلند
چوٹیوں پر "اپنشدی گیتوں" کے ساتھ دیوان حافظ کی معرفت میں ڈوبی
ہوئی غزلوں نے مدتوں انہیں والہانہ بیخودی و سرشاری کے درس دئے
تھے اور صوفیائے اسلام کے تذکروں نے ان میں عارفانہ زندگی کی
ایک ایسی لہر پیدا کر دی تھی جس کی سرمستی سے وہ ہمیشہ سرشار رہے۔"

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ دیویندر ناتھ نہ صرف فارسی سے آگاہ تھے بلکہ وہ حافظ کے حافظ تھے۔ آپ کو شاعری سے والہانہ محبت تھی۔ آپ بات بات میں فارسی اشعار دہراتے تھے۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں ہوگی اگر مستقبل میں کبھی یہ پتہ چل جائے کہ دیویندر ناتھ نے خود بھی فارسی میں چند اشعار کہے تھے۔ آپ کی خود نوشت سوانح عمری میں آپ نے کئی فارسی اشعار نقل کئے ہیں (جو حافظ کے ہیں)۔ غالباً انہوں نے اردو میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ آپ کے عہد میں اردو بول چال کی ایک شہری زبان ضرور بن گئی تھی لیکن عالموں کی نظر میں فارسی ہی کی قدر و قیمت تھی اور وہ اردو کو علمی ادبی زبان تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اردو جانتے ہوئے بھی اس عہد کے عالم اردو میں لکھا نہیں کرتے تھے۔ دیویندر ناتھ نے جو اپنی سوانح عمری لکھی ہے اس میں ایک دو اردو مکالمے ملتے ہیں۔ مثلاً "سر دیا تو رونا کیا"۔

آپ نے انگریزی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم پائی تھی لیکن کہاں تک تعلیم پائی تھی اس کا علم نہیں۔ ان کے سوانح نگاروں نے اتنا لکھا ہے کہ ابتدا میں وہ رام موہن رائے کے قائم کئے ہوئے انگلو ہندو اسکول میں داخل ہوئے تھے اور بعد میں (۱۸۳۱ء) ہندو کالج قائم ہونے پر اس میں داخلہ لیا تھا۔

۱۸۳۴ء میں ان کی شادی سارداسندری دیوی سے ہوئی۔ ۱۸۳۹ء سے آپ روحانیت کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتے گئے اور ۲۱ دسمبر ۱۸۴۳ء کو بیس ۲۰ دوستوں کے ہمراہ آپ نے برہمو دھرم قبول کر لیا۔ ۱۸۵۳ء میں آپ نے "برہمو ودیالیہ" قائم کیا اور ۱۸۶۰ء میں برہمو سماج کے صدر ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں برہمو سماجیوں نے آپ کو "مہرشی (مہا + رشی = مہرشی) کا خطاب دیا جس کے بعد سے آپ مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر کے نام سے جانے جانے لگے۔ آپ مادری زبان میں تعلیم کے حق میں تھے۔ ۱۸۴۰ء میں آپ نے جو مدرسہ "تتو لودھنی پاٹھ شالہ" کے نام سے قائم کیا

اس میں بنگلہ زبان کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا صحافت سے بھی آپ کا لگاؤ تھا۔ ۱۸۶۱ء میں
آپ کی مالی امداد سے اخبار "انڈین مرر" جاری ہوا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں آپ نے ضلع بیر بھوم کے بھوبن
ڈنگہ میں زمین خریدی اور وہاں ایک آشرم قائم کیا۔ بھوبن ڈنگہ کا یہی آشرم آج کا "شانتی نکیتن" ہے۔
مہرشی دیویندر ناتھ برطانوی ہند انجمن (British India Society)
کے سکریٹری ہوئے تھے۔ اس انجمن کی طرف سے ایک اپیل فارسی میں گورنر سے کی گئی تھی جس کا عنوان
"درخواست بمادہ بازیافت لاخراج" ہے۔ اس درخواست پر بحیثیت صدر فارسی میں دیویندر ناتھ
کا دستخط ہے اور یہ درخواست برٹش میوزیم لائبریری، لندن میں محفوظ ہے۔ آپ بیوہ کی شادی
اور تعلیم نسواں کے طرفدار تھے۔ "بیتھون سوسائٹی" کے بانیوں میں سے آپ بھی ایک ہیں اور آپ نے اپنی
بیٹی (سودامنی) کو بیتھون اسکول میں داخل کیا تھا جو اس زمانے میں ایک دلیرانہ اقدام تھا۔ آپ سیر
سیاحت کے متوالے تھے۔ ہمالیہ اور شملہ کی پہاڑیوں کے علاوہ غالباً آپ نے ملک چین اور برما کا
سفر بھی کیا تھا۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۰۵ء کو ۸۹ برس کی عمر میں آپ انتقال کر گئے۔

سرادا دیوی ـــــــــ والدہ
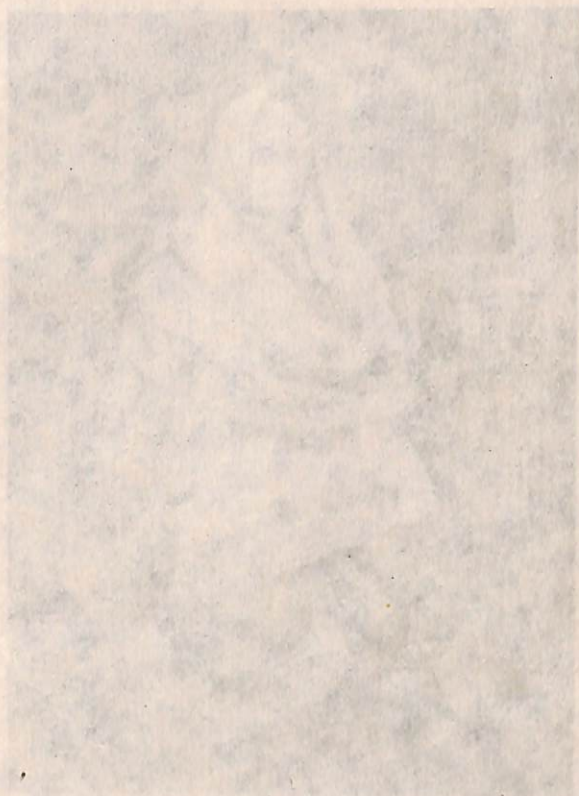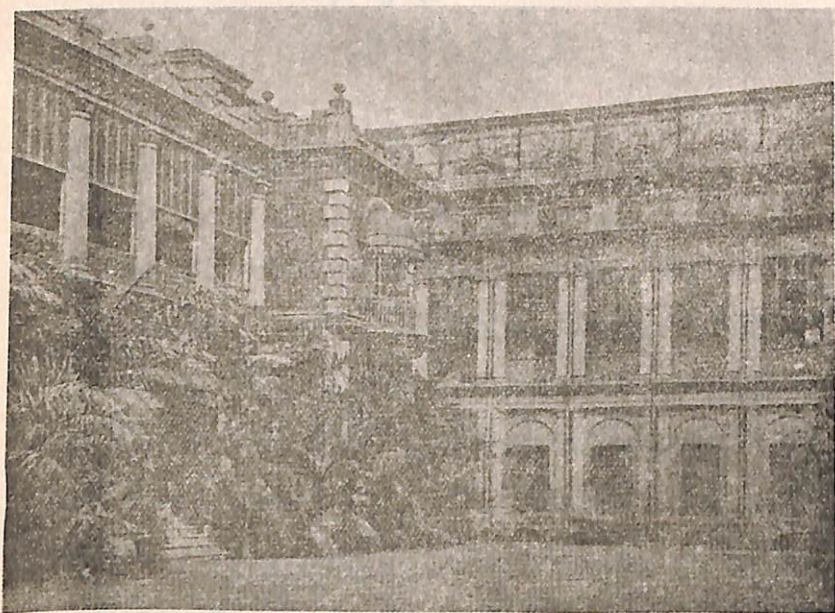
جائے پیدائش
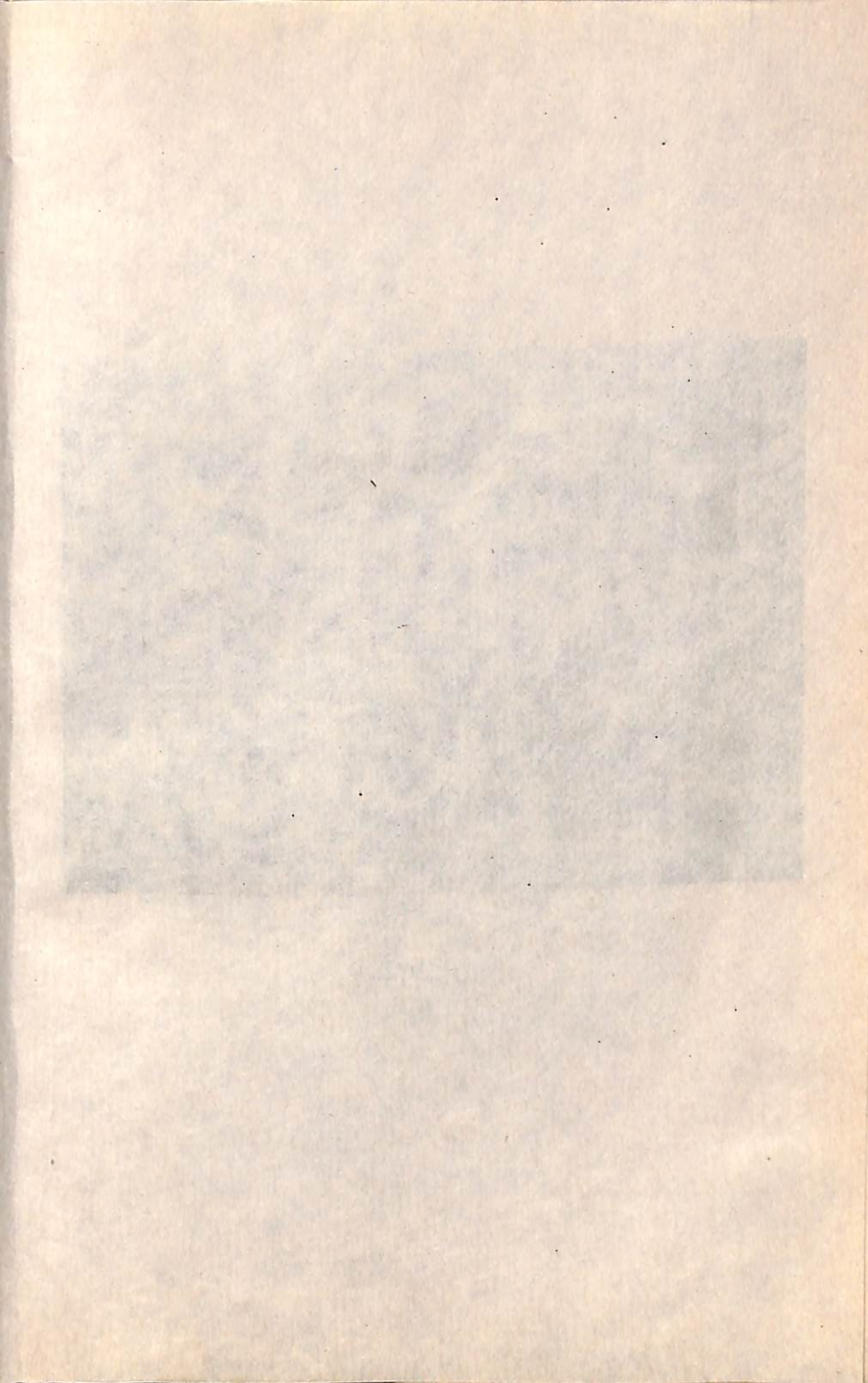
رابندر ناتھ ٹھاکر

حیات رابندر ناتھ ٹھاکر کو قلمبند کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور چند صفحات میں تو یہ ناممکن ہے اس لئے کہ رابندر ناتھ محض کسی شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، مقالہ نگار، زبان داں، ڈرامانگار، گیت نویس، سنگیت کار، گلوکار، موسیقار، مصور، اداکار، مدیر، معلم، ماہر تعلیم، خطوط نویس، مورخ، ماہر السنہ، ہومیو پیتھی ڈاکٹر، فلسفی، سماج سدھارک، سیاست داں، وطن دوست، انسان دوست اور جہاں گردہی کا نام نہیں ہے بلکہ تاریخ ہند (اور تاریخ عالم میں) انیسویں صدی کی آخری دہائی سے بیسویں صدی کی تین دہائیوں کے خاتمے تک کا ایک مکمل دور ہے۔ ہماری تہذیبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کا۔ ایک طرف اگر رابندر ناتھ کی تخلیقات دفتر طلب ہیں تو دوسری طرف ان پر لکھی گئی تصانیف کا شمار بھی دوبھر ہے۔ پھر دنیا بھر کی ادبی زبانوں میں رابندر ناتھ کی بے شمار تخلیقات کا ترجمہ ہوا ہے اور ملک ملک کے قلم کاروں نے حیاتِ ٹھاکر اور ان کے ادب پر ان گنت مضامین نظم و نثر لکھے ہیں۔ دیگر زبانوں کا تو ذکر کیا خود بنگلہ زبان کے کئی اہل قلم حضرات کا خیال ہے کہ ابھی تک رابندر ناتھ کی زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر حقیقی معنوں میں تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ حال ہی میں نامور ادیب شری نیپال مجومدار[1] نے ایک مقالے میں رابندر ناتھ کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن پر بنگلہ زبان میں تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج سے برسوں پہلے (۱۹۴۱ء میں) ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے رابندر ناتھ پر لکھتے ہوئے[2]

---

[1] سہ ماہی بنگلہ تحقیقی رسالہ "ایکاتان" کلکتہ۔ ٹھاکر نمبر، ۱۹۸۶ء

[2] بنگلہ ماہنامہ "بھارت درشن" ماہ آشن بنگلہ سن ۱۳۴۸ مطابق ۱۹۴۱ء

لکھا ہے کہ جن لوگوں کو ملک ملک کے سفر کا موقع ملا ہے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ربندرناتھ ٹھاکر ہندستان کے سب سے بڑے Ambassador (سفیر) ہیں۔ ربندرناتھ ایک ایسا جادوئی نام ہے جس کی وجہ سے دنیا کے کونے کونے میں ہندستانیوں کو عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر چٹرجی نے اپنے ایک مضمون میں دنیا کے مختلف ممالک میں سفر کے دوران ٹھاکر کا ہم وطن ہونے کی وجہ سے ان کو جو عزت ملی اور کئی مشکل کاموں میں یہ نام جس طرح ان کے لئے مشکل کشا ہوا اس کا دلچسپ ذکر کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ امریکا کے ایک نامور ادیب اوپل ڈوارنٹ نے اپنی ایک کتاب ربندرناتھ کو روانہ کرتے ہوئے اپنے قلم سے اس پر ربندرناتھ کے سلسلے میں لکھا:

"You are the reason why India should be free."

یعنی ربندرناتھ کے سلسلے میں مصنف نے لکھا کہ ــــ "تم ہو ــــ اور محض اس لئے ہندستان کو ایک آزاد ملک ہونے کا حق ہے۔"

۱۹۱۲ء میں رسالہ Poetry Review نے بھی لکھا[1]:

"Rabindranath Tagore is the strongest argument in favour of Indian Nationalism that we have get encountered."

حیاتِ ٹھاکر پر یوں تو کئی تصانیف موجود ہیں لیکن پربھات کمار مکھوپادھیائے کی تصنیف اس سلسلے میں مستند تسلیم کی جاتی ہے۔ چار جلدوں میں حیاتِ ٹھاکر کو قلمبند کر کے انہوں نے بنگلہ ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنا لیا ہے۔ چونکہ میرا ارادہ صرف سوانح عمری پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی ادبی، سماجی اور سیاسی خدمات پر بھی روشنی ڈالنی ہے لہٰذا میں نہایت مختصر طور پر سال بہ سال ان کی زندگی کے اہم واقعات کو ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

۷-۱۸۶۱ء

ولادت بمقام جوڑاساکو، دوارکا ناتھ ٹھاکر لین، کلکتہ۔ ۷ رمئی مطابق بنگلہ تاریخ ۲۵ ربیشاکھ ۱۲۶۸ء۔ انگریزی تاریخ کے مطابق ربندرناتھ کا جنم دن نہیں منایا جاتا لہٰذا ہر سال

---

[1] وشوابھا۔ ربندرناتھ۔ مؤتر یا دیوی۔ صفحہ ۳۳

مرینالینی دیوی ——— اہلیہ
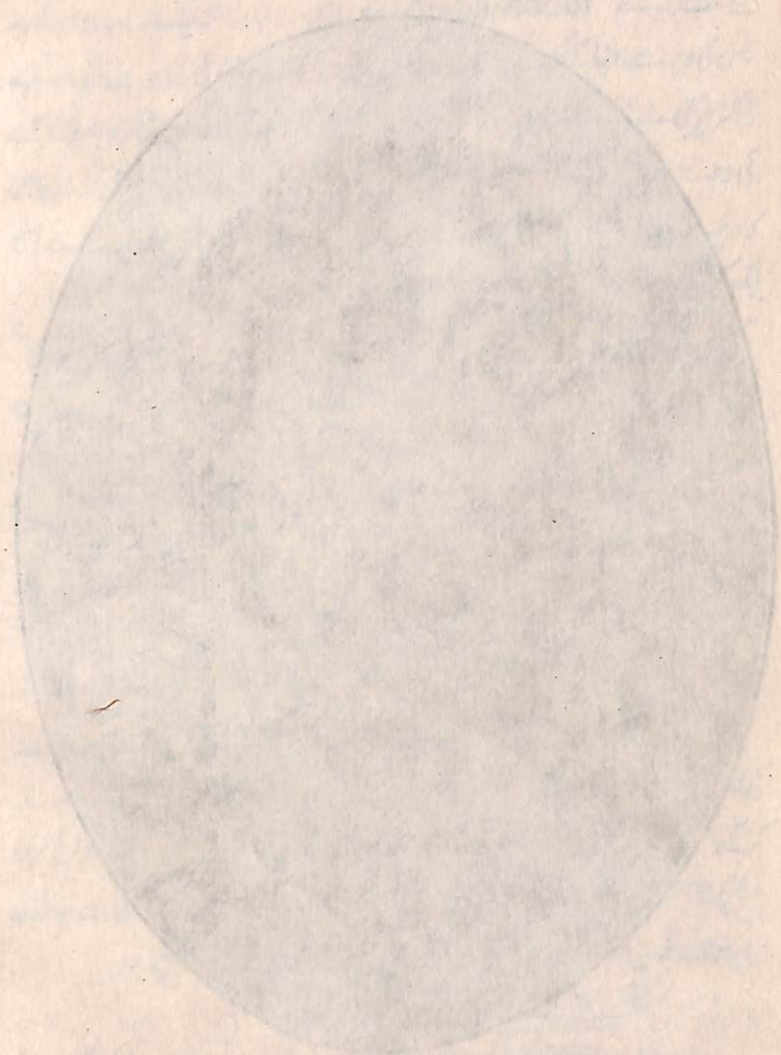
۷ مئی کو یوم ٹھاکر نہیں ہوتا۔ جس طرح اس سال ۲۵ بیساکھ (۱۹۸۶ء) ۹ مئی رہی ہے۔
والد مہرشی دویندر ناتھ ٹھاکر اور والدہ سارداسندری دیوی۔ ربندر ناتھ کے لفظی معنی "فرزند آفتاب"
ہے۔ گھر میں عام طور پر وہ مختصر نام "ربی" (بمعنی آفتاب) سے پکارے جاتے رہے۔ اردو تصانیف
میں "ربی" کو "رابی" لکھا گیا ہے۔ چونکہ اردو والوں نے یہ انگریزی املا RABI سے ترجمہ کیا ہے۔ ربندر
ناتھ کی ولادت کے وقت دیویندر ناتھ ٹھاکر کی عمر ۴۵ برس تھی۔ بعض حضرات نے ربندر ناتھ
کو چودھویں اور آخری اولاد لکھا ہے۔ چودھویں تو درست ہے لیکن "آخری" درست نہیں اس
لئے کہ ربندر ناتھ کے بعد ۱۸۶۳ء میں ان کے ایک اور بھائی بودھیندر ناتھ پیدا ہوئے تھے
لیکن صرف سال بھر بعد مر گئے۔ (دیکھئے اگلے صفحات پر شجرہ خاندان)۔ ابتدائی تعلیم اورینٹل
سمینری اسکول (۱۸۶۸ء)، نارمل اسکول (۱۸۷۰ء) اور پھر بنگال اکادمی (۱۸۷۱ء)
پھر ۱۸۷۴ء میں سینٹ زیویرس اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ اس سال انہوں نے شیکسپیئر
کے "میک بیتھ" اور کالی داس کے "کمار سمبھو" کا ترجمہ کیا تھا۔ گھر پر بھی مختلف مضامین پڑھانے
کے لئے معلم مقرر تھے لیکن ربندر ناتھ کو اسکول کی تعلیم راس نہیں آئی اور نہ ہی انہوں نے پابندی
سے تعلیم حاصل کی۔ شاعری کی ابتدا ۱۸۶۹ء میں ہوئی جب وہ صرف آٹھ برس کے تھے۔ ۱۸۷۳ء
میں اپنے والد کے ساتھ پہلی بار گھر سے باہر نکلے اور ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں میں سفر کیا۔ اسی
سال انہوں نے "پرتھوی راج کی شکست" ڈراما لکھا۔

۱۸۷۵ء

والدہ سارداسندری دیوی ۱۰ مارچ کو انتقال کر گئیں۔ اسی سال ربندر ناتھ نے "ہندو میلا"
میں پہلی بار نظم سنائی جو "ہندو میلے کا تحفہ" کے عنوان سے "امرت بازار پتریکا" میں شائع ہوئی۔

۸۰-۱۸۷۸ء

۲۰ ستمبر کو بمبئی ہو کر انگلستان روانگی۔ لندن یونیورسٹی میں (انگریزی ادب) تعلیم اور
۱۸۸۰ء میں واپسی۔ "کوبی کاہنی" (مجموعہ کلام) کی اشاعت۔ رسالہ "بھارتی" میں سفر انگلستان
کے سلسلے میں قسط وار مضامین کی اشاعت۔

۱۸۸۱ء

پہلی بار "برہمو سنگیت" کی تخلیق۔ ڈراما "والمکی پرتیبھا" کی تخلیق اور بطور والمکی اداکاری

بیتھون سوسائٹی کی طرف سے میڈیکل کالج کلکتہ کے ہال میں "سنگیت فن اور فکر" پر لیکچر۔ چندن نگر میں چند روز قیام۔

۱۸۸۳ء

۹ دسمبر کو بینی مادھب رائے چودھری کی بیٹی بھوتارینی دیوی سے شادی۔ بینی مادھب، ٹھاکر گھرانے ہی میں ملازمت کرتے تھے۔ اس طرح اسی گھرانے کے ایک ملازم کی بیٹی سے رابندر ناتھ کی شادی ہوئی۔ یہ اس لئے کہ ٹھاکر گھرانہ "پیرالی" برہمن گھرانہ تھا اور ان دونوں اونچے برہمن گھرانے کے لوگ ٹھاکر گھرانے سے رشتہ نہیں جوڑتے تھے۔ ٹھاکر گھرانے میں بہو بھوتارینی کا نام بدل کر مرنالینی دیوی رکھا گیا۔ چونکہ بھوتارینی نام اس گھر والوں کو پسند نہیں آیا (اور عام طور پر ان دنوں ــــ آج بھی چند گھروں میں ــــ شادی کے بعد سسرال والے بہو کو کوئی نیا نام دیتے تھے) اس سے پہلے شاعر کے بڑے بھائی جیوتندر ناتھ کی بیوی کا نام "کادمبینی" سے بدل کر "کادمبری" رکھا گیا تھا۔ شادی کے دنوں مرنالینی کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔ مرنالینی کو رئیس ٹھاکر گھرانے کے لائق بہو بنانے اور گھر کی دیگر خواتین کے مقابلے میں لانے کے لئے رابندر ناتھ نے اس کی تعلیم و تربیت پر کافی دھیان دیا تھا۔ نہ صرف رابندر ناتھ بلکہ مہرشی دیویندر ناتھ نے بھی بہو کی تعلیم پر زور دیا اور ان کے حکم ہی سے مرنالینی کو لاریٹو کرسچن اسکول میں داخل کیا گیا تھا۔

۱۸۸۴ء

وفات بھابی کادمبری دیوی۔ یہ بھابی ہمیشہ ادبی تخلیقات کے سلسلے میں رابندر ناتھ کی ہمت افزائی کرتی تھی ــــ "آدی برہمو سماج" کے سکریٹری ہوئے۔

۱۸۸۵ء

ہزاری باغ اور بمبئی کا سفر ــــ رسالہ "بالک" میں بچوں کے لئے نظمیں اور ناٹک لکھے۔

۱۸۸۶ء

رابندر ناتھ کی زبانی ان کی برہمو سنگیت سن کر مہرشی دیویندر ناتھ کا خوش ہونا اور پانچ سو روپیہ بیٹے کو انعام دینا جو رابندر ناتھ کی زندگی میں پہلا انعام ہے ــــ بیوی اور بیٹی (مادھوری) کے ساتھ دارجلنگ جا کر چند روز رہنا۔

سنہ ۱۸۸۹ء

زمینداری کی ذمہ داریوں کو قبول کرنا اور اس سلسلے میں شلائی داہ کو روانگی۔

سنہ ۱۸۹۰ء

انگلستان کا دوسرا سفر۔ ۲۳ر اگست تا ۳ر نومبر۔

سنہ ۱۸۹۱ء

بیٹی رینوکا کی پیدائش (۲۳ر جنوری) ــــ رسالہ "سادھنا" اور "ہیت وادی" کے لئے افسانے لکھنا ــــ شانتی نکیتن میں برہمو مندر کی تعمیر ــــ زمینداری کے سلسلے میں اڑیسہ کا سفر۔

سنہ ۱۸۹۴ء

"بنگیہ ساہتیہ پریشد" کے نائب صدر ہوئے ــــ رسالہ "سادھنا" کے مدیر بنے ــــ لوریوں اور لوک گیتوں سے دلچسپی کا زمانہ۔

سنہ ۱۸۹۸-۹۹ء

مدیر ماہنامہ "بھارتی" ــــ کلکتہ میں پلیگ پھیلنے پر علاج اور ریلیف کا کام ــــ بال گنگا دھر تلک پر مظالم کے سلسلے میں حکومت سے سخت احتجاج ــــ بیوی بچوں کے ساتھ شانتی نکیتن اور پھر شلائی داہ میں قیام۔

سنہ ۱۹۰۱ء

مدیر رسالہ "بنگ درشن" (دور دوم) ــــ دو بیٹیوں کی شادیاں ــــ مظفرپور کے بنگالیوں کی طرف سے شاعر کا استقبال ــــ شانتی نکیتن میں صرف پانچ طلبہ کو لے کر برہمو چاریہ ودیالیہ کی ابتدا ــــ جنوبی افریقہ میں برٹش سامراجیوں کے مظالم کے خلاف احتجاج۔

سنہ ۱۹۰۲ء

وفات مرنالینی دیوی (۲۳ر نومبر)۔ انتقال کے دنوں مرنالینی کی عمر ۳۲ برس کی تھی اور رابندرناتھ ۴۱ برس کے۔

سنہ ۱۹۰۳ء

وفات بیٹی (۱۹ر ستمبر)۔

۱۹۰۵ء

وفات مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر (۱۹ر جنوری) ـــــ لارڈ کرزن کے تقسیم بنگال کے خلاف تحریک میں شاعر کا عملی طور پر حصہ لینا اور بنگال میں جشن راکھی بندھن (عوام میں اتحاد اور اور بھائی چارگی کے لئے) کی بنا ڈالنا۔ شاعر ٹھاکر نے خود اپنے ہاتھوں سے کئی گھوڑا گاڑی کے مسلمان کوچوانوں کے ہاتھوں میں راکھی بندھوا کر ان کو بھائی بنالیا۔ اسی تحریک کے سلسلے میں رابندر ناتھ نے کئی گیت لکھے اور گائے۔ یہ گیت ان دنوں کافی مقبول ہوئے۔ یہ تحریک رابندر ناتھ کی زندگی میں پہلا سیاسی قدم رہا ہے جب انہوں نے کھل کر عملی طور پر حصہ لیا۔ مضمون "امپیریلیزم" کی اشاعت۔

۱۹۰۷ء

چھوٹی بیٹی میرا کی شادی ـــــ ہندو مسلم فرقہ پرستی سے دلی رنج وغم کا اظہار۔ بنگیہ ساہتیہ سمّیلن (بنگلہ ادبی کانفرنس) کی صدارت ـــــ مونگیر میں چھوٹے بیٹے شمی بندر ناتھ کی موت ـــــ اربندو گھوش کی گرفتاری پر نظم "اربندو۔ میرا اسلام لے لو" کی تخلیق۔ مشرقی بنگال ادبی کانفرنس کے سلسلے میں پابنا کا سفر۔

۱۹۱۰ء

۲۹ر جنوری کو بیٹے رتھی در ناتھ کی شادی پرتیما دیوی سے۔ پرتیما دیوی، گگن در ناتھ کی بہن، بنودینی دیوی کی بیوہ بیٹی تھی۔ اس دور میں بیوہ بیٹی کو بہو بنا کر لانا ربندر ناتھ کے لئے ایک نہایت جرأت مندانہ انقلابی اقدام تھا۔ اس شادی کے موقع پر ربندر ناتھ نے مشہور ناول "گورا" کا انتساب اپنے بیٹے کے نام کیا۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ تین سال پہلے ادبی ماہنامہ "پرباسی" کے مدیر راما نند چٹوپادھیائے نے شاعر کو تین سو روپیہ پیشگی روانہ کر کے ان سے کسی تخلیق کی فرمائش کی تھی اور ربندر ناتھ نے افسانہ "ماسٹر جی" بھیجا تھا لیکن بعد میں ان کو ایسا محسوس ہوا کہ تین سو روپیہ اس چھوٹے سے افسانے کے لئے حق محنت قبول کرنا زیادتی ہے لہٰذا اگست ۱۹۰۷ء سے انہوں نے قسط وار "گورا" لکھنا شروع کیا اور مارچ ۱۹۱۰ء کے "پرباسی" میں اس کی آخری قسط شائع ہوئی۔ "گورا" ربندر ناتھ کا مشہور سیاسی ناول ہے۔ بنگلہ "گیتانجلی" کی اشاعت ـــــ شانتی نکیتن میں طلبہ کی تعداد میں معقول اضافہ ـــــ

لڑکیوں کے لئے ہاسٹل اور بچوں کے لئے "بچوں کا گھر" کی تعمیر

سنہ ۱۹۱۲ء

بنگیہ ساہتیہ پریشد کلکتہ کی طرف سے ٹاؤن ہال میں عظیم الشان استقبالیہ جلسہ ــــ مئی میں ولایت کا تیسرا سفر ــــ اس سفر میں بیٹا رتھن درناتھ اور بہو پرتیما دیوی بھی ساتھ تھیں۔ سفر کے دوران ولایت میں کئی نامی گرامی ادبا و شعراء سے ملاقاتیں۔ ۱۲ر جولائی کے شاندار استقبالیہ جلسہ کی صدارت مشہور شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس (William Butler Yeats) نے کی اور صدارتی تقریر میں کہا ــــ

"ایک فنکار کی زندگی میں وہ دن نہایت اہم ہوتا ہے جس دن وہ کوئی حیرت انگیز تخلیق کا مطالعہ کرتا ہے۔ ایسی تخلیق جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ میری زندگی میں آج یہ عظیم واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے آج ربندرناتھ کو خوش آمدید کہنے کا فخر حاصل ہوا۔ ان کے لکھے ہوئے کوئی ایک سو گیت اور نظموں کا ترجمہ میرے ہاتھوں میں ہے جسے ساتھ ساتھ لئے پھر رہا ہوں۔ میرے ہمعصر کسی اور کی ایسی انگریزی نظموں کا مجھے علم نہیں جس کی نظموں سے ان کی نظموں کا کوئی مقابلہ کرسکوں۔"

آخر فیصلہ ہوا کہ شاعر ایٹس اس کا پیش لفظ لکھیں گے۔ ایٹس کے مقدمہ کے ساتھ گیتانجلی کے اس ترجمہ کو انڈین سوسائٹی نے نومبر میں Song Offerings کے نام سے شائع کیا۔ سی۔ ایف۔ انڈروز سے پہلی ملاقات۔ یہی انڈروز بعد میں ہندستان چلے آئے اور ٹاگور ربندرناتھ کے ساتھی رہے۔ آپ ہندستان کے بڑے ہی ہمدرد تھے ــــ انگلستان میں چار ماہ گزار کر بیٹے اور بہو کے ساتھ امریکا روانگی ــــ شکاگو اور ہاورڈ یونیورسٹی میں لکچر۔

سنہ ۱۹۱۳ء

۱۳ر نومبر کو نوبل ادبی انعام کا اعلان۔ ہندستان ہی نہیں بلکہ کسی ایشیائی باشندے کو اب تک یہ انعام نہیں ملا تھا۔ شانتی نیکیتن میں عوام کی طرف سے پُرمسرت خیر مقدم۔

۱۹۱۵ء

شانتی نکیتن میں گاندھی جی اور کستوربا کی آمد ـــــ ۳۱ جنوری کو "سر" کا خطاب
سفر کشمیر۔

۱۹۱۶ء

جاپان کا پہلا سفر اور جاپان میں سامراج مخالف تقاریر۔ ان تقاریر میں The Nation اور The Spirit of Japan نہایت اہم ہیں۔ یہ پہلی عالمگیر جنگ کا دوسرا سال تھا۔ ان دنوں جاپان طرح طرح سے چین کے خلاف اقدامات کر رہا تھا۔ چین جو صدیوں کے بعد حال ہی میں آزاد ہوا تھا اور جہاں اشتراکی سماج کی تعمیر ابتدائی مرحلہ پر تھی۔ تب بھی چین کے اندر سرمایہ دار اور سامراج پرست طاقتیں چینی حکومت کے خلاف سازشیں کر رہی تھیں۔ ایسے میں جاپان نے حملہ کر دیا اور امن کے لئے ایسی شرائط رکھیں جنھیں کوئی بھی آزاد ملک قبول نہیں کر سکتا ہے۔ شاعر نے سب کچھ دیکھا، سُنا، غور و فکر کیا اور پھر اپنے خیالات کو جاپانی عوام کے سامنے رکھا۔ لیکن جاپان کی جنگجو حکومت غلام ملک (ہندستان) کے ایک شاعر کے ایسے خیالات کو کیسے برداشت کرتی لہٰذا جاپانی حکومت نے ربندر ناتھ کے خلاف ایسے اقدامات کئے کہ شاعر کے لئے جاپانی عوام سے تعلقات کے دروازے ہی بند ہو گئے اور مجبوراً شاعر کو جاپان ـــــ سے لوٹنا پڑا ـــــ امریکا کا دوسرا سفر اور مختلف مقامات پر تقاریر۔ ان تقاریر میں بھی انھوں نے امریکی سرمایہ دارانہ سماج کی مخالفت کی جس کی وجہ سے امریکی اخبارات نے ٹھاکر کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ لیکن ٹھاکر نے یہ اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ ایک طرف کل کارخانوں کے مالکان دولت مند ہو رہے ہیں اور دوسری طرف امریکی عوام بری طرح لُٹ رہے ہیں۔ شاعر نے تقاریر میں بتایا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہی ہوتا ہے۔

۱۹۱۷ء

جاپان کا دوسرا سفر رسالہ "سبوج پتر" میں عام بول چال کی زبان میں افسانہ "پہلا نمبر" کی اشاعت ـــــ ڈراما "ڈاک گھر" میں اداکاری ـــــ کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں پہلے دن کانگریس کے پلیٹ فارم سے نظم سنانا ـــــ یہی کانگریس اجلاس وہ آخری اجلاس تھا جس میں شاعر شریک ہوئے تھے۔

۱۹۱۸ء

جرمنی کی شکست اور ۱۲ نومبر کو جنگ عظیم کا خاتمہ ـــــ وشوا بھارتی یونیورسٹی کا قیام (۲۳ دسمبر کو) ــــــ جنوبی ہند کا پہلا سفر۔

۱۹۱۹ء

جلیانوالہ باغ میں ہندستانیوں پر انگریزوں کا بے رحمانہ مظالم اور گولیوں سے نہتے ہندستانیوں کا قتل عام ــــ شاعر کی بے چینی اور آخر کار اپنے دلی رنج و غم کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے وائسرائے ہند کے نام تاریخی خط لکھنا اور خطاب "سر" کو برطانوی حکومت کو لوٹا دینا ــــ وشوا بھارتی کا کام شروع ہوا ــــ جنوبی ہند کا سفر ختم کرنے کے بعد شاعر کا سفرِ آسام۔

۱۹۲۰ء

احمد آباد میں گجراتی ساہتیہ سمیلن میں شرکت ــــ گاندھی جی کے سابرمتی آشرم میں ایک رات بسر ــــ ولایت کا چوتھا سفر ــــ "سر" کا خطاب انگریزی حکومت کو لوٹا دینے کے بعد اُن کا یہ پہلا سفر انگلستان تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ انگریز ان کے خلاف غصہ سے لال ہو گئے ہیں۔ برٹش پارلیمنٹ میں جلیانوالہ باغ پر بحث تھی۔ شاعر پارلیمنٹ کا اجلاس دیکھنے گئے لیکن دیکھا کہ وہاں اصلیت پر پردہ ڈالا جا رہا ہے اور حکومت جلیانوالہ باغ میں قتل و خون کو حق بجانب قرار دینے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر شاعر پارلیمنٹ کے اجلاس سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے ولایت سے انڈروز کے نام جو خط لکھا اس میں ولایت کی اس تہذیب کو Devil's Workshop "شیطان کا کارخانہ" قرار دیا ــــ انگلستان سے فرانس، ہالینڈ، بلجیم وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے اکتوبر میں امریکا کا تیسرا سفر

۱۹۲۱-۲۲ء

امریکا سے مارچ میں لندن واپسی ــــ وسط یورپ کا سفر ــــ ہاوارڈ یونیورسٹی میں لکچر ــــ برلن میں شاعر کی آواز کو ریکارڈ کرنا ــــ پارس میں روماں رولا (Romain Rolland) سے ملاقات ــــ وطن واپسی، گاندھی جی کا کلکتہ آنا اور جوڑاسانکو میں جاکر شاعر سے ملاقات کرنا ــــ مختلف مقامات پر وشوا بھارتی کے لئے مالی امداد قبول کرنے

جانا — بمبئی اور احمد آباد کا سفر۔

۱۹۲۳ء

شمالی ہند ادبی کانفرنس کی صدارت — شانتی نکیتن میں شعبۂ طالبات قائم کرنا آسام کا سفر — وشوا بھارتی ٹرسٹ اور وشوا بھارتی شعبۂ اشاعت قائم کرنا — جیل میں قید شاعرِ بغاوت قاضی نذرالاسلام کے نام رابندر ناتھ نے اپنے مجموعۂ کلام "بسنت" کا انتساب کیا — بڑے بھائی ستندر ناتھ کا انتقال۔

۱۹۲۴ء

کلکتہ یونیورسٹی میں ادب پر تین لکچر — اپریل میں سفرِ چین۔ شاعر جب چین (شہر پیکنگ) میں تھے تو ان کا جنم دن (۲۵ بیساکھ) آیا اور چینی عوام نے شاعر کو ساتھ لیکر نہایت دھوم دھام سے چینی ڈھنگ پر یہ جنم دن منایا۔ شاعر کو نیلے رنگ کا پاجامہ، نارنگی رنگ کا چغہ اور بیگنی رنگ کی ٹوپی پہنائی گئی۔ شاعر نے اسی چینی لباس میں اُس دن کے جلسے کو خطاب کیا۔ اس دن چینی عوام نے شاعر کو اپنا شاعر قرار دے کر ان کا چینی نام "چو۔چین۔تانگ" رکھا جس کے معنی "برق سا طاقتور آفتابِ ہند" ہے اور چینی عوام سے محبت سے دیا ہوا اپنا یہ نیا نام قبول کرتے ہوئے "آفتابِ ہند" رابندر ناتھ مسکرائے — جون میں جاپان کا تیسرا سفر — یورپ کا پانچواں سفر — جنوبی امریکا کا سفر۔

۱۹۲۶ء

جنوری، فروری میں مشرقی بنگال کا سفر۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں The Philosophy of Art کے عنوان پر لکچر — جون میں اٹلی کا دوسرا سفر (پہلا سفر سال گزشتہ کر چکے تھے جو نہایت مختصر تھا) مسولینی سے ملاقات — سفرِ مصر — یورپ میں البرٹ آئن اسٹائن سے ملاقات۔

۱۹۲۷ء

مغربی ہند کا سفر۔ آسام کا دوسرا سفر — مشرقی ایشیا، جاوا، سماترا، سنگاپور، پے نانگ، ملایا، جزیرہ بالی وغیرہ کا سفر — بھرت پور ہندی سمیلن کی صدارت۔

۱۹۲۹ء

سفرِ کناڈا — جاپان کا چوتھا دورہ — انڈوچین میں تین دن

۱۹۳۰ء

ولایت کا ساتواں دورہ ـــــ آکسفورڈ اور ہبرٹ میں لیکچر۔ پارس میں مصوّری کی
کی نمائش اور بعد میں یہی نمائش برمنگ ہم، برلن، میونک، کوپن ہیگن، ماسکو، اور بر سٹن شہروں
میں ـــــ ستمبر میں سوویت روس کا سفر، ماسکو پہونچنے۔ پر شاعر کا سواگت غیر ممالک سے
ثقافتی تعلقات کے صدر پروفیسر پے تروف نے کیا۔ شام میں روسی ادبا، و شعرا اور دانشوروں
سے ملاقات کا انتظام ماسکو کی ادبی انجمن نے کی۔ یہاں سوویت آرٹ اکاڈمی کے صدر پروفیسر کوگان،
ماسکو یونیورسٹی (دوسری) کے پروفیسر پن کیوچف، مادام لت بنوپر، قراین بارا اور مشہور ناولسٹ گلائیوکوف
وغیرہ سے شاعر کا تعارف ہوا۔ چند روز بعد پاو نیر کمیون دیکھنے گئے اور وہاں بچوں سے ملے۔ ایک دن
مرکزی کسان گھر میں جاکر کسانوں سے ملے۔ اور تفصیلی گفتگو کی۔ ماسکو اسٹیٹ میوزم میں ٹھاکر کی
مصوری کے نمونوں کی نمائش ہوئی۔ ترتیا کوف آرٹ گلیری کے سکریٹری پروفیسر کرسٹی ـــــ
(Prof Kristie) نے شاعر کی مصوّری کے سلسلے میں کہا ـــــ "ہمارے خیال میں مصوری
کے یہ نمونے زندگی کا بہترین فنکارانہ اظہار ہے۔ آپ کے یہ طریقے ایسے اعلیٰ تکنیکی کارناموں میں ہیں جو
کہ ہم دیگر ممالک سے سیکھنے اور اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نمونے ہمارے ملک کے لئے نہایت کارآمد ہوں
گے ـــــ" روس میں رابندر ناتھ کی آخری تقریر ۲۴ ستمبر کو ٹریڈ یونین ہال میں ہوئی۔ سوویت شاعر
ستنکلی نے ایک نظم رابندر ناتھ کی نذر کی۔ ادیب گال پیرن نے شاعر کی تین نظموں کا روسی ترجمہ
سنایا اور اداکار نیمو کوف نے "ڈاک گھر" کے ترجمے سے کچھ پڑھا۔ دوسرے دن ۲۵ ستمبر کو شاعر ماسکو
سے برلن روانہ ہوا۔ ـــــ امریکا کا پانچواں سفر ـــــ اسی دوران ہندستان میں
نمک ستیہ گرہ کی وجہ سے گاندھی اور نہرو وغیرہ گرفتار ہوئے اس سلسلے میں رابندر ناتھ کی لندن میں
انگریزی حکومت کے مظالم کے خلاف تقاریر اور مانچسٹر گارڈین" میں احتجاجی مضمون کی اشاعت
ـــــ آکسفورڈ میں Religion of Man کے عنوان پر لیکچر جو بعد میں کتابی طور پر چھپا۔
برمنگ ہم میں Civilisation and Progress کے عنوان پر لیکچر ـــــ جولائی میں جرمنی کا
دورہ ـــــ برلن میں آئن اسٹائن سے ملاقات ـــــ برناڈ شا سے شاعر کی ملاقات
ـــــ برلن ریڈیو سے تقریر ـــــ اکتوبر میں ایک اور بار امریکا کا سفر ـــــ میونک

یونیورسٹی کے پروفیسروں کی طرف سے استقبالیہ ــــ جینوا میں Internationalism کے عنوان پر لکچر۔

۱۹۳۱ء

سنسکرت کالج کلکتہ کی طرف سے شاعر کو "سربہ بھوم" کا خطاب۔ ہجلی جیل میں گولیاں چلانے پر شاعر کا احتجاج اور ۲۶ ستمبر کو موجودہ شہید مینار میدان کے جلسۂ عام سے خطاب "گولڈن بک آف ٹیگور" (Golden Book of Tagore) کی اشاعت۔ ٹاؤن ہال کلکتہ میں شاعر کا شہریوں کی طرف سے استقبال۔

۱۹۳۲ء

ایران اور عراق کا سفر ــــ کلکتہ یونیورسٹی میں "رام تنو لاہری" پروفیسر شپ کلکتہ میں مصوری کی نمائش۔ پہلی آزاد نظم "پونشچہ" کی اشاعت۔ چھوت چھات کے خلاف تحریریں ــــ گاندھی جی کے گرفتاری کے خلاف احتجاج اور جیل جاکر گاندھی جی سے ملاقات۔

۱۹۳۳ء

کلکتہ یونیورسٹی سے تعلیمی مسائل پر لکچر ــــ بمبئی، والیٹر اور حیدرآباد (دکن) کا سفر ــــ آندھرا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچر

۱۹۳۴ء

پانی ہٹی میں باسنتی جوٹ مل کے مزدوروں کے جلسہ میں تقریر ــــ بہار میں زلزلہ سے متاثر لوگوں کے لئے امداد کی اپیل ــــ ناول "چار ادھیائے" کی تخلیق ــــ بنارس ہندو یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی سند "ڈی لٹ" ــــ شانتی نکیتن میں آدی باسی قبائل کے لئے "سنتالی دیہاتی کوآپریٹیو اسٹورس" کا افتتاح اور کوآپریٹیو تحریک (امداد باہمی) کی اہمیت اور ضرورت اور آدی باسی عوام کی فلاح وبہبود پر زور دیتے ہوئے شاعر کی تقریر ــــ یاد رہے کہ جس علاقے میں شانتی نکیتن ہے یعنی ضلع بیربھوم کے دیہات بھوبن ڈنگا اور سوری، یہ علاقے سنتالی لوگوں کے ہیں لہٰذا ربندرناتھ نے سنتالوں کی زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ ٹھاکر کی مصوری اور شاعری میں سنتالوں کی زندگی کے نقوش پائے جاتے ہیں اور

اور خاص کر نندلال بوس جو عرصۂ تک شانتی نکیتن میں رہے انہوں نے سنتالوں کی زندگی کو اپنی مصوری میں خاص مقام دیا ہے ـــــ کلکتہ میں تعلیمی ہفتہ کا افتتاح ـــ سینٹ ہال میں مسئلۂ تعلیم پر لکچر ـــــ سفر لاہور ـــ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچر ـــــ

۱۹۳۶ء

وشوا بھارتی کے لئے برلا سے ساٹھ ہزار روپیہ عطیہ لاکر گاندھی جی نے رابندر ناتھ کو دیا۔ رابندر ناتھ نے دہلی ریڈیو سے نظم سنائی ـــ ڈھاکہ یونیورسٹی سے "ڈی. لٹ" سند ـــ فرقہ پرستی اور تقسیم ہند کے خلاف شاعر کی تقاریر اور مضامین کی اشاعت ـــــ کلکتہ میں خواتین کے جلسہ میں تقریر ـــــ قحط کے سلسلے میں امداد کی اپیل ـــــ ترقی پسند مصنفین کی اپیل برائے عالمی امن پر دستخط ـــ

۱۹۳۷ء

۱۷ فروری کو کلکتہ یونیورسٹی میں لکچر ـــ ۱۴ اپریل کو "چینا بھون" کا افتتاح انجمن "بھارت تیرتھ" (آندھرا) کی طرف سے شاعر کو "کوی سمراٹ" کا خطاب ـــــ انڈمان کے قیدیوں کو ہندستان واپس لانے کے لئے جلسۂ عام میں تقریر اور شانتی نکیتن میں "یوم انڈمان"، ۱۰ ستمبر کو باوجود خرابیٔ صحت کے کسانوں کے وفد سے ملاقات ـــــ

۱۹۳۸ء

رقص ڈراما "چنڈالیکا" کو اسٹیج کرنا۔ ۷ جنوری کو "یوم چین" منایا۔ اور عوام سے چینی عوام کی مدد کی اپیل۔ خود اپنی طرف سے ۸ اپریل کو پانچ سو روپیہ عطیہ دینا اور جواہر لال نہرو کو بھی امداد کے لئے ٹیلی گرام کرنا ـــــ "ہندی بھون" کا سنگ بنیاد رکھنا۔ سرت چندر چٹرجی کے انتقال پر دلی رنج و غم کا اظہار۔ ۲۱ جنوری کو سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے بیان۔ ۲۱ اپریل کو شاعر مشرق علامہ اقبال کی موت پر اظہار افسوس ـــــ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے شاعر کو "ڈی. لٹ" سند ـــ ۲۴ دسمبر کو کلکتے میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس میں شاعر کا پیغام پڑھا جانا۔

(دسمبر ۱۹۳۸ء کے اواخر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس کا نام لیا گیا ہے)

اس کی صدارت شاعرِ اعظم ٹیگور نے قبول کرلی تھی لیکن عین وقت پر ناسازیٔ طبع کے سبب وہ شریک کانفرنس نہ ہوسکے اور اپنا پیغام بھیجا۔)

۳۰ر جنوری کو شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ایس کے انتقال پر اظہارِ افسوس۔ ۱۹ر اگست کو مہاجاتی سدن'' کلکتہ کا سنگِ بنیاد رکھا اور جلسہ کی صدارت۔ ۲۹ر اگست کو ''جشن ہل چلاؤ'' کی صدارت

۲۷ر اگست کو فرقہ وارانہ تقسیم ہند کے خلاف شاعر کا بیان اور ہندو مسلم اتحاد پر زور۔ شانتی نکیتن میں نہرو اور سبھاس بوس کی آمد۔ نہرو کے ہاتھوں ''ہندی بھون'' کا افتتاح تین دن شہر پوری میں قیام اور مہاراجہ پوری کی طرف سے ''پرم گرو'' کا خطاب ——

سنہ ۱۹۴۰ء

۱۵ر فروری کو شانتی نکیتن میں گاندھی جی اور کستوربا کی آمد اور شاعر سے ملاقات۔ اس بار گاندھی جی دو دن شانتی نکیتن میں رہے جانے سے قبل رابندرناتھ نے گاندھی جی کے ہاتھوں ایک خط دیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان کے بعد وشوا بھارتی کو چلانے کی ذمہ داری گاندھی جی قبول کریں۔ خط لے کر گاندھی جی کلکتہ لوٹ آئے تھے اور وہ خط مولانا آزاد (ابوالکلام) کو دے دیا تھا۔ اس واقعہ کو برسوں گزر گیا۔ نہ رابندرناتھ رہے اور نہ گاندھی جی۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد ہند کے وزیرِ تعلیم ہوئے اور سنہ ۱۹۵۱ء میں حکومت ہند نے وشوا بھارتی کی ذمہ داری کو قبول کرلیا۔

اکسفورڈ یونیورسٹی سے بیمار شاعر کو ڈی لٹ کی سند —— موچنگ اور کالم پانگ کا سفر —— وفات انڈروز (۵ر اپریل)

سنہ ۱۹۴۱ء

راجا تریپورہ کی طرف سے ''بھارت بھاسکر'' (آفتاب ہند) کا خطاب ——

شاعر کا بیمار رہنا اور علاج کے لئے جوڑاسانکو کلکتہ کے مکان لوٹ آنا۔ ۳۰ر جولائی کو آپریشن ہوا۔ آپریشن سے کچھ پہلے شاعر نے اپنی زندگی کے آخری چند اشعار کہے۔ ان اشعار پر نہ وہ نظرِ ثانی کرسکے اور نہ ہی وہ اپنے ہاتھوں سے لکھ پائے لہذا یہ اشعار صرف نوٹ کرلئے گئے۔ ان کے یہ اشعار مجموعۂ کلام ''شیش لیکھا'' (آخری تحریر) کے آخری اشعار ہیں —— اس وقت صبح کے ساڑھے نو (۹½) بجے تھے۔ آپریشن ہوا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر وہ آخری وقت آگیا۔ ۲۲ر ساون، بنگلہ سن ۱۳۴۸ مطابق ۷ر اگست بوقت ۱۲ بج کر دس منٹ پر شاعر نے ۸۰ برس ۳ ماہ کی عمر میں جوڑاسانکو کلکتہ کے مکان کے مہرشی بھون میں آخری سانس لی۔

شجرہ

دوارکا
۱۷۹۴ء

- بیٹی، جو بچپن ہی میں مرگئی
- دیویندر ناتھ
  ۱۸۱۷ء - ۱۹۰۵ء
  شریک حیات
  سارداد یوی
- نریندر ناتھ
  صرف تین برس کی عمر
  میں انتقال کرگئے۔

- بیٹی (۱۸۳۸ء)
  بچپن ہی میں مرگئی
- دیجیندر ناتھ
  ۱۸۴۰ء —— ۱۹۲۶ء
- ستیندر ناتھ
  ۱۸۴۲ء —— ۱۹۲۳ء
- ہیمندر ناتھ
  ۱۸۴۴ء —— ۱۸۸۴ء
- بریندر ناتھ
  ۱۸۴۵ء —— ۱۹۱۵ء
- سوداminی
  ۱۸۴۷ء —— ۱۹۲۰ء
- جیوتی ریندر ناتھ
  ۱۸۴۹ء —— ۱۹۲۵ء
  شریک حیات
  کادمبری دیوی
- سکماری
  ۱۸۵۰ء —— ۱۸۶۴ء

---

① گریندر ناتھ ولد دوارکا ناتھ

۱۸۲۰ء —— ۱۸۵۴ء
شریک حیات
جوگ ماپا دیوی

- گگن درناتھ
  ۱۸۴۱ء —— ۱۸۶۹ء
- کادم بینی
- کومودینی
- گوئندر ناتھ
  ۱۸۴۶ء —— ۱۸۸۱ء
  شریک حیات ۔سَودامنی دیوی

- گگن نیندر ناتھ
  ۱۸۶۷ء - ۱۹۳۸
- سمرنیندر ناتھ
  ۱۸۷۰ء - ۱۹۵۱ء
- ابنندر ناتھ
  ۱۸۷۱ء - ۱۹۵۱ء
  (مشہور عالم مصوّر)
- بی نینی
  پریتما دیوی
  ۱۸۹۳ء —— ۱۹۶۹ء
- سُونینی

خاندان

ناتھ ٹھاکر

۱۸۴۶ء

۵۰

(۱)

گریندر ناتھ
۱۸۲۰ء — ۱۸۵۴ء
شریکِ حیات
جوگ مایا دیوی

بھوپیندر ناتھ
۱۸۲۶ء — ۱۸۳۹ء

بگیندر ناتھ
۱۸۲۹ء — ۱۸۵۸ء
شریکِ حیات
ترپورہ سندری دیوی

پونیندر ناتھ
۱۸۵۱ء — ۱۸۵۷ء

شرت کماری
۱۸۵۴ء — ۱۹۲۰ء

(۲)
سرن کماری
۱۸۵۶ء — ۱۹۳۲ء
شوہر جانکی ناتھ گھوشال

برن کماری
۱۸۵۸ء — ۱۹۴۸ء

سومیندر ناتھ
۱۸۵۹ء — ۱۹۲۲ء

(۳)
ربندر ناتھ
۱۸۶۱ء — ۱۹۴۱ء
شریکِ حیات
مرنالینی

بودھیندر ناتھ
۱۸۶۳ء — ۱۸۶۴ء

---

(۲)

سرن کماری ولد دیویندر ناتھ

۱۸۵۶ء — ۱۹۳۲ء

شوہر — جانکی ناتھ گھوشال

ہرن موئی
۱۸۶۸ء — ۱۹۲۵ء

جوت سنا ناتھ
۱۸۷۱ء — ۱۹۶۲ء

سرلا دیوی
۱۸۷۲ء — ۱۹۴۵ء /

اُرملا
۱۸۷۳ء — ؟

(۳) ربندر ناتھ ٹھاکر
ولد مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر
۱۸۶۱ء —— ۱۹۴۱ء
شریک حیات
وفات ۔ ۱۹۰۲ء
مادھوری لتا (بیلا)
۱۸۸۶ء —— ۱۹۱۸ء
شوہر، شرت کمار چکرورتی
(لاولد)
رتھیندر ناتھ
۱۸۸۸ء —— ۱۹۶۱ء
شریک حیات
پرتیما دیوی
رینوکا (رانی)
۱۸۹۱ —— ۱۹۰۳ء
میرا (اترشی)
۱۸۹۲ء —— ۱۹۶۹ء
شوہر، نگیندر ناتھ گنگوادھیاے
وفات ۱۹۵۲ء
شمیندر ناتھ
۱۸۹۶ء —— ۱۹۰۷ء
گود لی ہوئی بیٹی
نندنی
نتیندر ناتھ
ولادت ۱۹۱۲ء وفات ۱۹۳۲ء
جرمنی میں
نندیتا
۱۹۱۶ء —— ۱۹۶۷ء
شوہر، کرشن کرپلانی

(٦)

تصانیف رابندر ناتھ ٹھاکر

رابندر ناتھ ٹھاکر نے اتنا بہت کچھ نظم و نثر میں لکھا ہے کہ اس کی ایک فہرست ترتیب دینا بھی مشکل کام ہے۔ کئی محققین نے تصانیف ٹھاکر کی فہرستیں ترتیب دی ہیں۔ لیکن ہر ایک کا خیال ہے کہ ان کی فہرست نامکمل ہے چونکہ رابندر ناتھ کے سیکڑوں خطوط اب بھی منظر عام پر نہیں آئے ہیں اور یقیناً چند منظوم اور نثری تخلیقات ایسی بھی ہیں جو یا تو کسی وجہ سے شائع نہیں ہوئیں یا پھر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئی تھیں لیکن بعد میں وہ کسی تصنیف میں جگہ نہیں پا سکیں اور اس طرح گم ہو گئیں۔ رابندر ناتھ کے انتقال کے بعد سے اب تک وشوا بھارتی کے شعبۂ اشاعت نے ایسی کئی تخلیقات کی چھان بین کی اور چند کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا۔ مختلف محققین نے جو فہرست کتب ترتیب دی (مثلاً برجندر ناتھ بندوپادھیائے، جوگیندر بھومک، پربھات کمار مکھوپادھیائے اور دیبا جیوتی مجومدار وغیرہ) ہیں۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ذیل کی فہرست تیار کی ہے۔ اس فہرست میں وہ تصانیف شامل نہیں ہیں جو ٹھاکر نے اپنے گیتوں کو گانے کے لئے سُر دیتے ہوئے لکھی ہیں یا پھر نصابی تصانیف کا بھی میں نے ذکر نہیں کیا ہے۔ ٹھاکر کی ایک ایک کتاب بار بار چھپی اور اب بھی نئے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن میں نے صرف اولین ایڈیشن کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی ان تصانیف کا جو شاعر کی زندگی میں شائع ہو کر منظر عام پر آئے، سوائے کلیات رابندر ناتھ کے جو وفات ٹھاکر کے بعد بھی نکلتے رہے اور اب بھی شائع ہو رہے ہیں۔ رابندر ناتھ کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ ادبی زبان میں ہوا ہے اور ان پر کئی تصانیف بھی لکھی گئی ہیں۔ ایسی تصانیف کی فہرست ترتیب دینا ممکن نہیں ہے ذیل میں پہلے بنگلہ تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد ایسی انگریزی تصانیف کا جن کا ترجمہ خود ٹھاکر نے کیا تھا جس کی وجہ سے ان تصانیف کو بھی ہم رابندر ناتھ کی تصانیف قرار دے سکتے ہیں۔

بنگلہ تصانیف

مجموعہ کلام اور گیت

۱۔ کوبی کاہنی ۔ نومبر ۱۸۷۸ء

۲۔ بن پھول ۔ مارچ ۱۸۸۰ء

حالانکہ "یہ کوبی کاہنی" سے دو سال پہلے کی تخلیق ہے ۔

۳۔ بھگنہ ہردیئے ۔ ۱۸۸۱ء

۴۔ سندھا سنگیت ۔ ۱۸۸۲ء

۵۔ پربھات سنگیت ۔ ۱۸۸۳ء

۶۔ چھبی دگان ۔ ۱۹۸۴ء

۷۔ شنئی شب سنگیت ۔ "

۸۔ بھانوسنگھ ٹھاکر پر پداولی "

۹۔ ربی چھایا ۔ ۱۸۸۵ء

۱۰۔ کوڑی وکومل ۔ ۱۸۸۶ء

۱۱۔ مانسی ۔ ۱۸۹۰ء

۱۲۔ سونارتری ۱۸۹۴ء

۱۳۔ بدائے ابھی شاپ ۔ "

۱۴۔ ندی ۔ ۱۸۹۶ء

۱۵۔ مالنی ۔ "

۱۶۔ چترا ۔ "

۱۷۔ چیتالی ۔ ۱۸۹۶ء

۱۸۔ کنی کا ۔ ۱۸۹۹ء

۱۹۔ کتھا ۔ "

۲۰۔ کلپنا ۔ ۱۹۰۰ء

۲۱۔ کاہنی ۔ "

۲۲۔ کھنی کا ۔ "

۲۳۔ نئی بیدیا ۔ ۱۹۰۱ء

۲۴۔ سمرن (سورن) ۱۹۰۲ء

۲۵۔ باؤل گیت ۔ ۱۹۰۵ء

۲۶۔ کھے یا ۔ ۱۹۰۶ء

۲۷۔ کتھا وکاہنی ۱۹۰۸ء

۲۸۔ شیشو ۱۹۰۹ء

۲۹۔ گیتانجلی ۱۹۱۰ء

اردو میں انگریزی گیتانجلی song offerings کے کئی ترجمے ہوئے لیکن پہلا ترجمہ "عرض نغمہ" کے نام سے ۱۹۱۴ء میں نیاز فتحپوری نے کیا ۔

۳۰۔ آت شر گہ ۱۹۱۴ء

۳۱۔ گیتی مالیہ "

۳۲- گیتالی۔ ۱۹۱۴ء
۳۳- بلاکا۔ ۱۹۱۶ء
۳۴- پلاتکا۔ ۱۹۱۸ء
۳۵- شیشو بھولاناتھ ۱۹۲۲ء
۳۶- پوربی۔ ۱۹۲۵ء
۳۷- پرباہنی۔ "
۳۸- لے کھن۔ ۱۹۲۶ء
۳۹- مہویا۔ ۱۹۲۹ء
۴۰- بن بانی ۱۹۳۱ء
۴۱- پری شیش ۱۹۳۲ء
۴۲- پونشچہ۔ "
۴۳- بچی تریتا۔ ۱۹۳۳ء
۴۴- شیش سپتک۔ ۱۹۳۵ء
۴۵- بیتھی کا۔ "
۴۶- پترپوٹ ۱۹۳۶ء
۴۷- شیاملی "
۴۸- سائیک پتر ۱۹۳۶ء
۴۹- کھاپ چھاڑا۔ "
۵۰- چھڑار چھبی۔ ۱۹۳۷ء
۵۱- پرانتِک ۱۹۳۸
۵۲- سے جوتی "
۵۳- گیت بیتان "
۵۴- پرباسنی۔ ۱۹۳۹ء
۵۵- آکاش پردیپ۔ "
۵۶- نب جاتک ۱۹۴۰ء
۵۷- سانائی (شہنائی) "
۵۸- روگ شجائے۔ "
۵۹- نارو گیہ۔ ۱۹۴۱ء
۶۰- گلپہ سلپہ۔ "
۶۱- جنم دینے۔ "
۶۲- چھڑا۔ "
۶۳- شیش لیکھا۔ "

ڈرامے

۱- بالمکی (والمکی) پرتیبھا۔ ۱۸۸۱ء
۲- ردر چنڈ "
۳- کال مرگیا ۱۸۸۲ء
۴- پرکرتیر پرتی شودھ ۱۸۸۴ء
۵- نلنی۔ "
۶- مایار کھیلا ۱۸۸۸ء
۷- راجا ورانی ۱۸۸۹ء
۸- بی سرجن ۱۸۹۰ء
۹- چترانگدا۔ ۱۸۹۲ء
۱۰- گوڑائے گلد "

۱۱- بدائے ابھی شاپ۔ ۱۸۹۴ء
۱۲- بیکنٹھ ڈ پر کھاتا۔ ۱۸۹۷ء
۱۳- کاہنی ۱۹۰۰ء
۱۴- ہاسیہ کوتک۔ ۱۹۰۷ء
۱۵- بیانگ کوتک ،،
۱۶- شادراُتسو ۱۹۰۸ء
۱۷- مکُوٹ۔ ،،
۱۸- پراسچتہ۔ ۱۹۰۹ء
۱۹- راجا۔ ۱۹۱۰ء
۲۰- ڈاک گھر۔ ۱۹۱۲ء
۲۱- مالنی۔ ،،
۲۲- اچلائتن۔ ،،
۲۳- پھالگونی۔ ۱۹۱۶ء
۲۴- گرُو۔ ۱۹۱۸ء
۲۵- اروپ رتن۔ ۱۹۲۰ء
۲۶- رین شودھ ۱۹۲۱ء
۲۷- مکت دھارا۔ ۱۹۲۲ء
۲۸- بسنت ۱۹۲۳ء
۲۹- گرہاپربیش ۱۹۲۵ء
۳۰- چرا کمار سبھا۔ ۱۹۲۶ء
۳۱- سودھ بودھ۔ ،،
۳۲- نٹی یر پوجا۔ ،،
۳۳- شیش پرشنہ۔ ،،
۳۴- رکت کربی۔ ،،
۳۵- ریتو رنگا۔ ۱۹۲۷ء
۳۶- پری تران۔ ۱۹۲۹ء
۳۷- شاپ موچن۔ ۱۹۳۱ء
۳۸- نبین ۱۹۳۲ء
۳۹- کالیر جاترا۔ ،،
۴۰- چنڈالیکا۔ ۱۹۳۳ء
۴۱- تاسیر دیش۔ ،،
۴۲- بانسری۔ ،،
۴۳- سرابن گاتھا۔ ۱۹۳۴ء
۴۴- ناٹیہ گیت پری شودھ۔ ۱۹۳۶ء
۴۵- نرتیہ ناٹیہ چترانگدا۔ ،،
۴۶- ،، مایار کھیلا۔ ۱۹۳۸ء
۴۷- شیاما۔ ۱۹۳۹ء
۴۸- مکتیر اوپائے ،،

ناول

۱- بوٹھاکرانیر ہاٹ۔ ۱۸۸۲ء
۲- راجرشی۔ ۱۸۸۵ء
بعد میں یہ ڈراما بھی ہوا۔
۳- چوکھیر بالی۔ ۱۹۰۲ء
۴- نوکا ڈوبی۔ ۱۹۰۶ء

۵۔ پرجاپتی یر نربندھا۔ ۱۹۰۸ء
۶۔ گورا۔ ۱۹۰۹ء
۷۔ گھرے باہرے۔ ۱۹۱۶ء
۸۔ چتورنگ۔ "
۹۔ جوگا جوگ۔ ۱۹۲۹ء
۱۰۔ ششیر کبی تا۔ ۱۹۳۰ء
۱۱۔ دوی بون۔ ۱۹۳۳ء
۱۲۔ مالنچہ۔ ۱۹۳۴ء
۱۳۔ چار ادھیائے۔ "

افسانوں کے مجموعے

۱۔ چھوٹو گلپہ۔ ۱۸۹۴ء
۲۔ بی چترا گلپہ (حصہ اول) "
۳۔ " " (حصہ دوم) "
۴۔ کتھا چتو ستیہ "
۵۔ گلپہ دشک ۱۸۹۵ء
۶۔ گلپہ گوچھہ۔ (حصہ اول) ۱۹۰۰ء
۷۔ گلپہ۔ ۱۹۰۱ء
۸۔ کرم پھل۔ ۱۹۰۲ء
۹۔ ہیت بادیر او پہار۔ ۱۹۰۴ء
۱۰۔ آئیتی گلپہ۔ ۱۹۱۱ء
۱۱۔ گلپہ چاری۔ ۱۹۱۲ء
۱۲۔ گلپہ سپتک۔ ۱۹۱۶ء
۱۳۔ پہلا نمبر۔ ۱۹۲۰ء
۱۴۔ لی پی کا۔ ۱۹۲۲ء
۱۵۔ گلپہ گوچھہ (حصہ اول معہ اضافہ) ۱۹۲۶ء
۱۶۔ " " حصہ دوم "
۱۷۔ " " حصہ سوم ۱۹۲۷ء
۱۸۔ سے ۱۹۳۷ء
۱۹۔ تین سنگی ۱۹۴۱ء
۲۰۔ گلپہ گوچھہ حصہ چہارم ۱۹۶۷ء

دیگر تصانیف

۱۔ یورپ پرباسیر پتر ۱۸۸۱ء
۲۔ بی بی دھ پرسنگہ ۱۸۸۳ء
۳۔ رام موہن رائے ۱۸۸۵ء
۴۔ آلوچنا۔ "
۵۔ سمالوچنا ۱۸۸۸ء
۶۔ منتری ابھی شیک ۱۸۹۰ء
۷۔ یورپ جاتریر ڈائری حصہ اول ۱۸۹۱ء
۸۔ " " حصہ دوم ۱۸۹۳ء

۹- پنچ بھوت۔ ۱۸۹۷ء
۱۰- اپنشو پرسما۔ ۱۹۰۱ء
۱۱- آتما شکتی ۱۹۰۵ء
۱۲- بھارت درشن۔ ۱۹۰۶ء
۱۳- بچی ترا پربندھ۔ ۱۹۰۷ء
۱۴- چرتر پوجا۔ "
۱۵- پراچین ساہتیہ۔ "
۱۶- ساہتیہ۔ "
۱۷- آدھونک ساہتیہ۔ "
۱۸- لوک ساہتیہ۔ "
۱۹- سیدھ تتو۔ ۱۹۰۹ء
۲۰- دھرم۔ "
۲۱- شانتی نکیتن۔ "
۲۲- جیون سمرتی۔ ۱۹۱۲ء
۲۳- چھنہ پتر۔ "
۲۴- پربندھ۔ ۱۹۱۶ء
۲۵- کرتا ر را چھلائے کرمہ ۱۹۱۷ء
۲۶- جاپان جاتری۔ ۱۹۱۹ء
۲۷- جاتری۔ ۱۹۲۹ء
۲۸- بھانو سنگھ پترا بلی۔ ۱۹۳۰ء
۲۹- مانب دھرمہ ۱۹۳۳ء
۳۰- راشیار چھٹی۔ "
۳۱- بھارت پتھک رام موہن "
۳۲- چھند۔ ۱۹۳۶ء
۳۳- ساہتیہ پیتھے۔ "
۳۴- جاپائے پارسے "
۳۵- پراک تنی۔ "
۳۶- کلا نتر۔ ۱۹۳۷ء
۳۷- وشو اپریچے۔ "
۳۸- بنگا بھاشا پریچے ۱۹۳۸ء
۳۹- چھیلے بیلا۔ ۱۹۴۰ء
۴۰- چترا لیپی۔ ۱۹۴۱ء
۴۱- شریتی۔ "
۴۲- آشرمیر روپ بکاش "

کلیاتِ ٹھاکر

۱- کابیہ گرنتھ۔ ۱۸۹۴ء کلیات نظم حصہ اول۔ مرتب، ست پرشاد گنگولی
۲- " ۴-۱۹۰۳ء نو جلدوں میں شائع ہوا۔
۳- ربندر گرنتھا بلی ۱۹۰۴ء ناول، ناٹک اور مختصر افسانے۔
۴- چیئیانیکا۔ ۱۹۰۹ء منتخب نظمیں۔

۵۔	کابیہ گرنتھ۔	۱۶۔ ۱۹۱۵ء	انڈین پریس نے دس جلدوں میں شائع کیا۔ جلد ۱ تا ۶ ۱۹۱۵ء میں اور باقی ۱۹۱۶ء میں
۶۔	سنکلن	۱۹۲۵ء	مضامین، خطوط اور ڈائری کا مجموعہ
۷۔	گیت بتیان	۱۹۳۱ء	گیتوں کا مجموعہ دو جلدوں میں۔
۸۔	"	۱۹۳۲ء	گیتوں کا تیسرا مجموعہ۔
۹۔	سنچئیتا	۱۹۳۱ء	منتخب بہترین نظمیں
۱۰۔	پتر دھارا۔	۱۹۳۸ء	خطوط، تین جلدوں میں۔

انگریزی تصانیف جن کا خود رابندر ناتھ نے ترجمہ کیا

1) Gitanjali (Song-Offerings)	Indian Society, London	1912
2) The Garduner (Poems)	Macmillan & Co.	1913
3) The Crescent Moon	,, ,,	,,
4) Chitra (Drama)	,, ,,	,,
5) Sadhana (Essays)	,, ,,	,,
6) One hundred poems of kabir	Indian society, London	1914
7) Personality (essays)	Macmillan & Co, New York	1917
8) Nationalism (,,)	,, ,, ,, ,,	,,
9) On Oriental Culture & Jahan s Mission	indo-Japan Association, Tokyo	1929
10) Mahatmaji and the depressed Humanity-	Viswa Bharati December	1932
11) East and West	Paris	1935
12) Twenty six songs of Tagore	,,	,,

مذکورہ تصانیف کے علاوہ کوئی ۲۵ کتابیں حیات ٹھاکر ہی میں انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہیں۔ بطور کلّیات رابندر ناتھ کی بنگلہ تخلیقات کو مختلف اداروں نے اپنے اپنے طور پر شائع کیا ہے۔ شعبۂ اشاعت وشوا بھارتی نے ۲۶ ضخیم جلدوں میں کلّیات کو پیش کیا۔ جلد اوّل ۱۹۳۹ء میں اور ۲۶ واں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وشوا بھارتی ہی نے ایک اور جلد یعنی جلد ۲۷ کو ۱۹۶۵ء میں پیش کیا۔ شعبۂ اشاعت وشوا بھارتی کے علاوہ وشوا بھارتی سے اجازت لے کر حکومت مغربی بنگال نے پہلی بار ۱۵ ضخیم جلدوں میں کلّیات ٹھاکر کو ۶۷-۱۹۶۱ء میں پیش کیا تھا اور پھر حکومت مغربی بنگال کلّیات کا ایک اور ایڈیشن شائع کر رہی ہے اور اس سلسلے کی جلد اوّل ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔

ٹھاکر گھرانے کا ماحول اور اُس عہد کا سماج

کسی فرد کی زندگی، تعمیر، کردار اور اس کے فکر و خیال کی نشوونما میں اس سماج اور گھریلو ماحول کے اثرات ہوتے ہیں جس میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ ابتدائی نقوش تو نہایت گہرے اور دیرپا اثر رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ربندر ناتھ ٹھاکر اس کلیہّ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

ٹھاکر گھرانہ پیرالی برہمن گھرانہ تھا۔ ان گھرانوں کے ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندو بھی میل ملاپ بمشکل رکھتے تھے لیکن اس کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ اگر ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ یہی وہ گھرانے ہیں جن کے افراد بدلتے ہوئے سماج کو، تاریخ کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ کو، سن سکے تھے۔ سمجھ پائے تھے اور ان لوگوں نے ابھرتے ہوئے سورج کا سواگت کیا۔ اور اس طرح نئے سماج میں نہ صرف مقام بنایا بلکہ تاریخ کو نیا رنگ دینے اور تاریخ کا رُخ موڑنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ یعنی یہ لوگ نبّاضِ وقت رہے ہیں۔ ایک طرف اگر اس دور کے قدیم مکتبِ فکر والوں نے ایسے افراد کو "غدار، نمک حرام، ملک و قوم دشمن" وغیرہ وغیرہ قرار دیا تو دوسری طرف یہی لوگ نشاۃ ثانیہ کے علمبردار کہلائے۔ تاریخ ہند میں ایسے چند افراد میں راجا ٹوڈرمل، راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں خاص کر سر سید احمد خاں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

پیرالی گھرانے عموماً کھاتے پیتے گھرانے تھے چونکہ شاہی دربار یا حاکم طبقہ سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ زمین اور جائداد کے مالک ہو گئے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں یہ ٹھاکر گھرانہ، اس عہد کے سماج سے بالکل کٹا ہوا گھرانہ تھا لیکن جب اس گھرانے کے افراد ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کلکتہ میں ایسے اور غیر ملکی تاجروں (انگریزوں) کا ساتھ دیتے ہوئے ملازمت کرتے ہوئے، ان کی تجارت سے منسلک ہو گئے تو اس گھرانے میں جیسے لکشمی آ گئی۔ یعنی وہ دولت مند ہو گئے۔ اس طرح دوار کا ناتھ ٹھاکر (رابندر ناتھ کے دادا) اپنے وقت کے نامور زمیندار، تاجر اور رئیس ہوئے۔ بہ الفاظ دیگر دوار کا ناتھ ٹھاکر اس عہد کے بورژوا سماج کے

ایک اہم ستون تھے، جس طرح راجہ رام موہن رائے رہے ہیں۔ اب راجہ رام موہن رائے ہوں یا دوارکا ناتھ، پیرالی سماج کے ہر فرد میں ایک سماجی اتحاد بھی پایا جاتا ہے چونکہ اس عہد کے ہندو سماج میں وہ اچھوت اور پنچ تھے (باوجود رئیس ہونے کے) اور نئے آنے والوں (انگریزوں) کے خیالات نے ان میں ایک نئی بیداری پھونک دی تھی۔ اگروقت کا ہندو سماج ان کا مخالف تھا تو وہ بھی ہندو سماج کے مخالف تھے۔ راجہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کی کہانی بھی یہی ہے۔ ہندو سماج کے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف رام موہن رائے نے جو تحریک چلائی اس کے ایک ساتھی دوارکا ناتھ تھے حالانکہ دوارکا ناتھ نے برہمو سماج کو قبول نہیں کیا تھا۔ اسی زمانے میں کلکتہ میں ہندو کالج، میڈیکل کالج اور انگریزی طرز تعلیم کی بنیاد پڑی تھی۔ زمینداروں نے "زمینداری سبھا" قائم کی اور اس رئیس نئے بورژوا سماج کے افراد نے انگلستان سے اپنے تعلقات بڑھائے۔

دوارکا ناتھ نے ہندو سماج کے کئی بندھنوں کو توڑ ضرور ڈالا تھا لیکن پھر بھی ان کے دور تک ٹھاکر گھرانے میں پوجا پاٹ اور شادی بیاہ کے قدیم رسوم بڑی حد تک برقرار رہے لیکن دوارکا ناتھ کے بعد ان کے بیٹے مہرشی دیویندر ناتھ (رابندر ناتھ کے والد) برہمو سماجی ہو گئے اور انہوں نے برہمو سماج کے مندر میں کھلے عام وید پاٹھ کرنے کی بنا ڈالی۔ جب کہ راجہ رام موہن رائے کے زمانے میں بھی کھلے عام وید پاٹھ (وید کے منتر پڑھنا) نہیں کی جا سکتی تھی اس خوف سے کہ کہیں کوئی غیر برہمن "وید وانی" نہ سن لے اور اس طرح اعلیٰ ذات کے برہمن ان کے دشمن نہ ہو جائیں۔ دیویندر ناتھ کا برہمو دھرم دراصل جدید یورپی خیالات کا ہندو دھرم پر اثر کا نمونہ ہے۔ دیویندر ناتھ کے ایسے خیالات کے رابندر ناتھ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی شانتی نکیتن میں قیام کے دنوں برہمو مندر میں ہر روز صبح دھیان کیا کرتے تھے۔

دوارکا ناتھ سے لے کر دیویندر ناتھ تک جو سماجی تبدیلیاں ہوئی تھیں ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ سماج میں جو معاشی تبدیلیاں ہوئی تھیں اس سے بورژوا دانشور متاثر ہوئے تھے اور اس کا اثر تھا کہ مذہبی تعلیم اور سماج سدھار کا رشتہ رفتہ رفتہ سیاست وقت سے جا ملا۔ لیکن ابتدا میں یہ سیاست انگریزوں کے خلاف نہیں گئی بلکہ نئے سماج کے یہ بورژوا رہنما اپنے سماج سدھار کے کاموں میں بھی انگریزوں کی مدد چاہتے رہے۔ یعنی سماج سدھار کی یہ تحریک یا تحریکیں کسی طور پر بھی انگریزوں کی مخالف

نہیں تھیں دراصل بنگال میں یہ سماجی تبدیلیاں برٹش سامراجیت کی بدولت پیدا ہوئیں اور رفتار زمانہ کے ساتھ کئی پُرپیچ راہوں سے ہوتے ہوتے ہندستانی سماج میں ایک عرصہ کے بعد قومی جذبات اُبھرنے لگے۔

انگریزوں کی معاشی پالیسی کی وجہ سے دیسی صنعتیں دم توڑ رہی تھیں اور سماج کی معاشی بنیادیں ہلنے لگی تھیں انگریزوں کی لوٹ کا ساتھ دینے کی وجہ سے چند ہندستانی امیر ضرور ہو گئے تھے لیکن سماجی طور پر کوئی ٹھوس معاشی نظام قائم نہیں ہو پایا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک ہمارے نئے دانشور انگریز تجارتی کمپنیوں کی دلالی کرتے یا انگریزوں کی ملازمت کرتے تھے اور یہی ان کے کھاتے پیتے گھرانے کے افراد ہونے کی وجہ رہی ہے۔ اسی وجہ سے اس دانشور طبقہ نے انگریز مخالف کسی جدوجہد میں کسی قسم کا کوئی حصّہ نہیں لیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سنتھالوں کی بغاوت، سپاہیوں کی بغاوت (غدر) اور نیل بغاوت، سنیاسی اور فقیر بغاوت وغیرہ وغیرہ کسی بھی بغاوت سے اس طبقہ کے لوگ دور رہے ہیں۔ (اور اگر دور نہیں رہے تو پھر انگریزوں کا ساتھ دیا ہے) لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان بورژوا دانشوروں کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز روحانیت اور سماجی رسم و رواج میں سدھار وغیرہ کی حد تک رہا ہے اور ایسی سماجی تحریکیں، سیاسی جدوجہد کی شکل اختیار نہیں کر سکی ہیں۔ دراصل وہ ایک ایسا عہد تھا جب ہمارے دانشور یورپی سماج سے ہمارے سماج کا مقابلہ کر کے صرف شرمندہ ہی ہوتے تھے چونکہ ان کی نظر میں یورپی سماج کی ہر شئے بہتر تھی۔ ہمارے دانشور اس عہد تک یورپ میں جو ترقی پسند تحریکیں ابھری تھیں ان سے لاعلم تھے یا ان سے کوئی سبق لینے اور ان کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھے ہم اس سلسلے میں صرف راجہ رام موہن رائے کو مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں۔ قیام انگلستان کے زمانے میں رام موہن نے وہاں کے ترقی پسند دانشوروں سے تعلقات قائم کئے تھے اور انہوں نے یورپ کے بدلتے ہوئے سماج کا اندازہ کر لیا تھا لیکن رام موہن رائے کا انتقال انگلستان ہی میں ہو گیا اور ان کے جدید ترقی پسند خیالات ہندستان تک پہنچ نہیں پائے۔

اس وقت کے رئیس دانشور جو سماج کے کرتا دھرتا تھے انگریزی حکومت کو ہندستان کے لئے نہایت ضروری سمجھتے تھے مثلاً ۱۸۳۱ء میں پرسنّا کمار ٹھاکر کے یہ الفاظ:[۵]

---

[۵] بنگلہ تصنیف "ہندستان میں قومیت اور بین الاقومیت اور رینذر ناتھ۔ نیپال مجومدار۔ حصّہ اول صفحہ ۵۔

"اگر ہم سے پوچھا جائے کہ ہم کس حکومت کو ترجیح دیں گے، انگریز یا کسی اور کو، تو ہم میں سے ہر کوئی یہی جواب دے گا: "بے شک انگریز، حتیٰ کہ ہندو حکومت کے مقابلہ میں بھی ــــ"

اور ولایت جا کر دوار کا ناتھ ٹھاکر نے انگریزوں کی تعریف ایسے الفاظ میں کی تھی:[۵]

"یہ انگلستان ہی تھا جس نے میٹروں اور ہتھیاروں کے ساتھ کلائیو اور کارنوالس کو ہندستان کی بہتری کے لئے بھیجا۔ یہ انگلستان ہی تھا جس نے دور دراز ملک ہندستان کو ایسے عظیم لوگ بھیجے جنہوں نے دنیا میں امن قائم کیا اور مشرق میں درست اور پائیدار طریقہ نظام کی بنیاد ڈالی ـــــ"

دوار کا ناتھ ٹھاکر یا پرسنّا کمار ٹھاکر کے ایسے خیالات پڑھ کر آج ہمیں حیرت ہو سکتی ہے لیکن ان دنوں انگریزی حکومت ہی ان کی نظر میں نہایت ترقی پسند حکومت تھی اور ہندستان کو وہی جدید دنیا کے قابل بنا سکتے تھے اور خاص کر یہ کہ اس رئیس دانشور طبقے کی پیدائش ہی انگریزوں کی بدولت ہوئی تھی۔

جسے تاریخ میں Bengal Renaissance یا بنگال کا نشاۃ ثانیہ کہا گیا ہے وہ بہت بڑی حد تک برہمو دھرم کی مذہبی تحریک کا دور ہے جس کا موازنہ یورپ کے پروٹسٹنٹ (Protestant) تحریک (سولہویں صدی میں عیسائیوں کی اصلاحی تحریک جس کا مقصد کلیسائے رومی سے علیحدہ ہونا تھا) سے کیا جا سکتا ہے۔ رام موہن رائے سے لے کر سودیشی تحریک کے عہد تک ہمارے دانشوروں کا دھرم سے متعلق تحریک پر ہی زیادہ جھکاؤ رہا ہے اور یہ تحریکیں دراصل صرف ہندو دھرم میں سدھار کی تحریکیں رہی ہیں اور وہ بھی اکثر و بیشتر صرف شہری علاقوں تک محدود رہی۔ اس تحریک کا کوئی اثر دیہاتی زندگی پر نہیں ہوا اور نہ ہی مسلمان اس تحریک سے کسی طور پر وابستہ رہے ہیں۔ بنگال کے نشاۃ ثانیہ کی ناکامی کے وجوہات میں یہ دونوں باتیں (یعنی تحریک کا شہروں تک محدود ہونا اور مسلمانوں کا اس سے الگ رہنا) نہایت اہم ہیں۔ مسلمان کیوں اس نشاۃ ثانیہ

۵۔ بنگلہ تصنیف "ہندستان میں قومیت اور بین الاقومیت اور ربندر ناتھ۔ نیپال مجومدار حصہ اول صفحہ ۵

سے دور رہے کی تفصیلات پیش کرنا یہاں ممکن نہیں ہے لہٰذا مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس دور کے سیاسی حالات ہی ایسے تھے! انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اور مسلمانوں کی حکومت لٹ جانے سے وہ بالکل مرجھا گئے تھے اور معاشی طور پر بھی مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ پر اس کا اثر ہوا تھا یہ نہیں کہ سب مسلمان مسلم دور حکومت میں خوشحال تھے لیکن شاہی مذہب ہونے والے کا کم از کم ان کو فخر ضرور حاصل تھا، اور سماج میں "راجا ذات" والوں کی ایک عزت یوں بھی ہوتی ہے) لہٰذا انگریزوں کی نظر میں مسلمان ہی ان کے نمبر ایک اور اصل دشمن تھے۔ اس عہد تک مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرح نئے بورژوا نہیں ابھرے تھے۔ مسلمان انگریزی تعلیم کے میدان میں بھی پیچھے رہے۔ چونکہ مذہب اسلام کے ہندستانی رہنما مسلمانوں میں یہ پرچار کرتے رہے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے ان کے مذہب کو خطرہ ہے اور وہ عیسائی ہو جائیں گے۔ ہم آگاہ ہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے والا پہلا ہندستانی ہونے کا شرف سر سید احمد خاں کو حاصل ہے جس دور تک ہندوؤں میں سیکڑوں افراد اعلیٰ انگریزی تعلیم پا چکے تھے۔

بہر حال دیویندر ناتھ ٹھاکر کے بعد کلکتہ کا یہ ٹھاکر گھرانہ نئی تہذیب و تمدن اور علم و ادب کا مرکز بنا۔ دیویندر ناتھ کے بیٹوں میں دیجیندر ناتھ، ستیندر ناتھ، جیوتی ریندر ناتھ اور اسی گھرانے کے دیگر افراد میں گگن درناتھ اور ابیندر ناتھ اور اس گھرانے سے قریبی تعلق رکھنے والوں میں راج نرائن وغیرہ وہ لوگ ہیں جن سے اس گھرانے میں قومی خیالات بیدار ہوئے۔ تعلیم اور سماج سدھار کے سلسلے میں دیویندر ناتھ کے جو اختلافات کیشب چندرسین سے تھے، خود دیویندر ناتھ کے بیٹوں نے ان اختلافات کو توڑ دیا اور اس طرح ترقی پسند خیالات اس گھرانے میں داخل ہوئے! اسی دور سے دیویندر ناتھ کے بیٹوں کا زمانہ شروع ہوتا ہے اور یہ گھر مختلف علوم و فنون کا ایک مرکز کے طور پر ابھرتا ہے۔ مہرشی دیویندر ناتھ کے بڑے بیٹے دیجیندر ناتھ بھی شاعری، فلسفہ، سنگیت، مصوری اور علم حساب میں اپنی مثال آپ تھے! انہوں نے ادبی رسالہ "بھارتی" جاری کیا تھا۔ دوسرے بیٹے ستندر ناتھ ہندستان کے پہلے آئی سی ایس ہوئے۔ مہرشی دیویندر ناتھ کا پانچواں بیٹا جیوتی رندر ناتھ نے بھی ڈرامہ، سنگیت اور مصوری میں نام کمایا۔ مہرشی کی ایک بیٹی سرن کماری دیوی بنگالیوں میں پہلی خاتون ہے جو ناول نگار کے طور پر مشہور ہوئیں۔ اس گھر کے گگن درناتھ اور ابیندر ناتھ (ربندر ناتھ کے چچیرے بھائی گوندر ناتھ کے دو لائق بیٹے)

ہندستانی مصوّری کے نامور استادفن ہوئے۔ اس طرح مصوّری، شعروشاعری، ادب، ناچ رنگ، گیت اور ڈراموں نے اس گھر کی چاردیواری میں قدم جما لئے۔ اور ساتھ ہی سماجی اور سیاسی بیداری کی لہریں۔ رابندرناتھ اسی مشہور گھرانے کا وہ آفتاب ہے جس نے ان تمام ستاروں کی روشنی کو سمیٹ لیا۔ اور دنیا بھر میں اس گھرانے کا نام امر کردیا۔ ٹھاکر گھرانے کے اس نئے ماحول نے رابندرناتھ کے کردار کی تعمیر میں جو عظیم حصہ لیا ہے اس کا اثر ہم ان کی آئندہ زندگی کے ہر ہر قدم میں پاتے ہیں۔

Visva-bharati represents India where
she has her wealth of mind which is for all.
Visva-bharati acknowledges India's obligation
to offer to others the hospitality of her best
culture and India's right to accept from
others their best.

Rabindranath Tagore

ٹیگور شانتی نکیتن میں
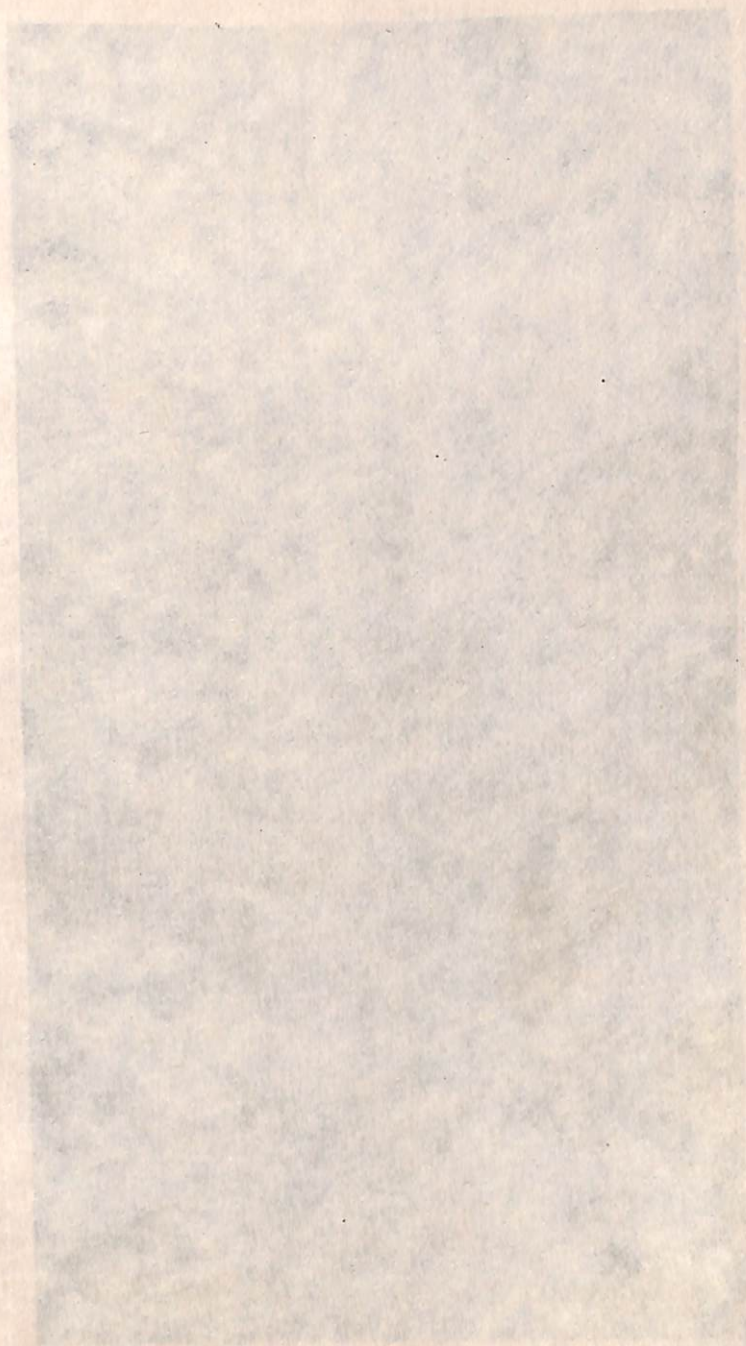
"گیتانجلی" اور نوبل انعام

بنگلہ سنہ ۱۳۱۷ (مطابق ۱۹۱۰ء) کے آخر میں ربندرناتھ[1] نے گیتانجلی کو مکمل کیا اور اسی سال درگا پوجا سے پہلے (یعنی ماہ اکتوبر سے پہلے) شائع کیا۔ گیتانجلی" وہ مشہور تصنیف ہے جس پر شاعر کو ادبی دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل انعام ملا۔ یہ انگریزی "گیتانجلی" یعنی ——— song offerings پر دیا گیا۔ انگریزی گیتانجلی بنگلہ کا ہوبہو ترجمہ نہیں ہے۔ بنگلہ "گیتانجلی" میں ۱۵۷ گیت ہیں اور انگریزی میں صرف ۱۰۳۔

گیتانجلی کو کسی بھی لحاظ سے ربندرناتھ کی بہترین تخلیق کہا نہیں جا سکتا۔ گیتانجلی سے قبل کی منظوم تخلیقات میں "مانسی" (۱۸۹۰) "سونار تری" (۱۸۹۳ء) اور "ویدیا" (۱۹۰۱ء) اہم مجموعے ہیں۔ "مانسی" تک پہنچتے پہنچتے شاعر کے فکر و فن میں پختگی آ گئی تھی وہ انگلستان اور فرانس وغیرہ کا سفر بھی کر چکے تھے۔ بنگال کی دیہی زندگی کو بھی انہوں نے قریب سے دیکھا تھا۔ سودیشی تحریک میں حصّہ لے چکے تھے لہٰذا "مانسی" کی نظموں میں دیہات کے قدرتی مناظر اور عام دیہاتی زندگی سے ہم شاعر کو قریب پاتے ہیں۔ "سونار تری" (سونے کی ناؤ) میں بقول سُکمار سین[1]

> "شاعر کے تجربات، مشاہدات اور انسانی قدروں کو سمجھنے کی کوشش کو نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ شاعر کی ذکاوت، جوش و خروش، چمک دمک، تندگی کو پرکھنے کی صلاحیت یہاں ابھر آئی ہے۔ یہاں زندگی کی بنیادوں کو اُجاگر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی شاعر کی انفرادیت بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ اشعار کی زبان میں نرمی اور سادگی ہے۔"

"سونار تری" میں رومانیت ضرور ہے لیکن یہ واضح ہے کہ شاعر عام لوگوں سے قریب آ گیا ہے "سونار تری" کے پیش لفظ میں شاعر نے لکھا ——— "انسان میرے دل کے قریب پہنچ گیا اور انہوں نے

---

[1] تاریخ بنگلہ ادب، سُکمار سین۔ ساہتیہ اکاڈمی۔ صفحہ نمبر ۲۰۵۔

مجھے بیدار کیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے سلسلے میں سوچا، کام کیا، کئی فرائض سامنے آئے اور ان فرائض سے آج بھی میرا خیال بچھڑا نہیں ہے۔ انسان سے قریب آنے پر میری زندگی میں ادب کا راستہ اور میرے کام کا راستہ (راہِ ادب اور راہِ عمل) دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے ــــــ"

ہم "سونار تری" میں صاف دیکھتے ہیں کہ شاعر نے آنکھیں کھول کر دنیا پر نظریں ڈالی ہیں۔ ہندستان میں جو انقلابی معاشی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں شاعر نے اُس کو محسوس کیا ہے۔ دیکھا اور سمجھا کہ جاگیردارانہ سماج (Feudal System) دم توڑنے کو ہے لیکن اس وقت تک جاگیردارانہ نظام مکمل طور پر مٹا نہیں تھا اور نہ ہی سرمایہ دارانہ نظام قائم ہو پایا تھا۔ لہٰذا "سونے کی ناؤ" جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کا درمیانی وقفہ اور ٹکراؤ کو پیش کرتا ہے کسان اپنی محنت سے سونے کی فصل اُگاتا ہے اور اُس کی فصل "سونے کی ناؤ" میں بھر لی جاتی ہے۔ (ہندستانی کسان خام مال پیدا کرتا ہے اور انگریز سرمایہ دار اُسے سونے کی ناؤ میں بھر کرلے جاتا ہے) کسان نے جان توڑ محنت سے فصل پیدا کی اور اس کی فصل سے ناؤ بھر لی گئی۔ ناؤ چلی گئی، فصل لے کر، دُور بہت دُور، سات سمندر پار لیکن کسان بیچارہ جہاں تھا وہیں بے یار و مددگار پڑا رہا۔ اس سونے کی ناؤ میں کسان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جس میں اس کی پیدا کی ہوئی فصل بھر لی جاتی ہے۔ شاعر نے کسان کی اس حالت کو کتنا صاف اور حسین پیرائے میں بیان کیا ہے :-

"میں
سنسان ندی کنارے ہی پڑا رہا
اور میرا جو کچھ تھا
وہ سب کچھ ــــ لے گیا
وہ سونے کی ناؤ ــــ"

بعض حضرات نے "سونے کی ناؤ" کا یہ مطلب نکالا ہے کہ انسان کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہے اُس کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہے اگر کچھ قیمت ہے تو وہ اُس کی محنت کی ہے، محنت کے پھل کی ہے۔ لہٰذا یہاں شاعر یہ کہتا ہے کہ محنت کے پھل سے کشتی بھر لی جاتی ہے لیکن اگر نام و نمود چاہو تو دھرے کے دھرے رہی۔ چونکہ دنیا صرف "محنت کا پھل" ہی قبول کرے گی۔ اگر ہم یہ مطلب بھی نکال لیں تو

صاف ہے کہ محنت کی اہمیت کو شاعر جان چکا تھا اور اسے افسوس تھا کہ محنت کا پھل تو لوگ اٹھا لیتے ہیں، کسان کی فصل تو لوگ لے لیتے ہیں لیکن بیچارے کسان کی حالت پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ اس سے بھی کسان سے شاعر کی ہمدردی صاف ظاہر ہے۔

"نویدیا" میں ہم شاعر کو ایک اور روپ میں پاتے ہیں۔ یہاں شاعر اور بھی بیدار ہے۔ اُس کا سیاسی شعور جاگ اٹھا ہے۔ ہندستان کی حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی اور اس کا دل رونے لگا ہے۔ لہذا "نویدیا" کی نظموں میں شاعر لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے یہاں شاعر کا لہجہ بھی بدل گیا ہے وہ دیگر شعراء کو بھی آواز دیتا ہے اور عوام کو جگانے کے لئے کہتا ہے۔

"اِس موت کو، سکوت کو توڑنا ہوگا
ان دیواروں کو گرانا ہوگا
پہاڑ جیسے جمے ہوئے کوڑا کرکٹ کو، گرد وغبار کو ہٹانا ہوگا
اے غفلت اور نیند کے متوالو
بیدار ہو جاؤ ——— اُٹھو
سنہری صبح کا سواگت کرو
سکوت توڑ دو، اور حرکت میں آجاؤ"

مجموعۂ کلام "کوڑی و کومل" جو ۱۸۸۶ء کی تخلیق ہے میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر کو زندگی سے بھرپور پیار ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عوام کے دلوں میں زندہ رہنے کا خواہاں ہے۔ شاعر نظم "پران" میں کہتا ہے:۔

"میں اس حسین جہاں میں
موت کا خواہاں نہیں ہوں
بلکہ ——— میں لوگوں کے دلوں میں
زندہ رہنا چاہتا ہوں!
آفتاب تلے
اس حسین گلشن میں

اگر زندہ دلوں میں، مجھے تھوڑی سی جگہ مل جائے"

محض اتنا ہی نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ لوٹ اور مظالم کے خلاف شاعر کا شعور بلند ہو چکا ہے اس نے نہ صرف ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے بلکہ دیگر قلم کاروں کو بھی للکارا ہے ان کی مشہور نظم "اب مجھے لوٹا دو" (لے بار پھر او مورے) جو گیتا نجلی سے ۱۷ برس پہلے کی تخلیق ہے میں وہ کہتے ہیں:-

"اب مجھے لوٹا دو
دنیا کے لوگ
آٹھوں پہر، اپنے کام میں مگن رہتے ہیں
اور تو
گھر سے بھاگے ہوئے، بھٹکے ہوئے بچے کی طرح
آگ برساتی دھوپ میں
ایک درخت کے سائے تلے
سنسان میدان میں
بالکل اکیلا
دن بھر بانسری بجاتا رہا ــــــ!

ارے تو جاگ، آنکھیں کھول
دیکھ، شعلے کہاں بھڑک اٹھے
کس کا سنکھ بج اٹھا
دنیا کے عوام کو بیدار کرنے کے لئے ــ!!

رونے کی صدا کہاں سے آرہی ہے؟
کہاں، کس اندھیرے میں

قیدی، یتیم مدد مانگ رہا ہے ؟

....

ظالم ——

غریبوں کی عزّت لُوٹ کر
کمزور وناتواں کا خُون چُوس کر
اُنہیں پامال وبرباد کرکے
اُن کے دُکھ درد کی ہنسی اڑا رہے ہیں

....

اُن اداس چہروں پر
صدیوں کے ظلم وستم کی کہانیاں ہیں
غریب بے چارے، جب تک جیتے ہیں
پیٹھ پر ہزاروں بوجھ لادے پھرتے ہیں
اور آخرکار ——
اولاد کو بطور وارث چھوڑ جاتے ہیں
دنیا کا بوجھ ڈھونے کے لئے

....

وہ روٹی کے دو ٹکڑوں کے بل پر
زندگی کے ٹمٹماتے دیپ کو جلائے رکھتے ہیں
اور جب کوئی ظالم
اُن ٹکڑوں کو بھی چھین لیتا ہے
موت کے بھیانک منہ میں دھکیل دیتا ہے
تب بھی یہ ناداں بچے
یہ نہیں جانتے کہ ——

انصاف کے لئے کس در کو کھٹکھٹائیں
صرف ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پکارتے ہیں
"بھگوان! بھگوان"!!
اور خاموش موت کی نیند سو جاتے ہیں

ان سب ناداں، اداس، بے زبانوں کو
زبان دینی ہو گی
ان سب مرجھائے دلوں کو
یقین سے بھرپور کرنا ہو گا
للکار کر کہنا ہو گا
تم سب سربلند کر کے، ایک ساتھ کھڑے ہو جاؤ
تم جن سے ڈرتے ہو
وہ ظالم
تم سے زیادہ کمزور ہیں ——!
جب تم جاگو گے، ایک ہو جاؤ گے
تب —— وہ ظالم، بھاگ جائیں گے، جھک جائیں گے
جب تم ان کے روبرو کھڑے ہو جاؤ گے
تب وہ ظالم
کتّوں کی طرح دم دبا کر بھاگ جائیں گے ——"

"گیتانجلی" سے پہلے ٹھاکر کے کلام کے ۲۷، ۲۸ مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ لیکن "گیتانجلی" کے بغیر گیتوں میں زندگی کی حرارت پائی نہیں جاتی۔ یہ گیت ہمیں جگانے کے بدلے سلانے کا کام کرتے ہیں۔ ان گیتوں میں نا امیدی ہے، مایوسی ہے، اداسی ہے، افسردگی ہے! اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا علم نہ ہو تو "گیتانجلی" کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ شاعر کی ان دنوں کی زندگی کا ذکر کرتے

ہوئے پربھات کمار مکھوپادھیائے لکھتے ہیں۔

"پوجا کی تعطیلات (شانتی نکیتن بند ہونے کی وجہ سے) میں وہ شیلاواہ گئے۔ وہاں چند رشتہ داروں اور دوستوں کے انتقال کی خبریں ملیں۔ دل میں بے شمار خیالات ابھرے۔ خود ان کی صحت بھی ناساز تھی۔ پیچش میں بھگت رہے تھے۔ تعطیلات کے بعد شانتی نکیتن لوٹے .... اُن دنوں دل نہایت بے چین تھا۔ روحانی سکون کی تلاش تھی۔ ہر روز صبح منہ اندھیرے مندر جاتے۔ دو چار ماسٹر اور طلبا وہاں ہوتے۔ عبادت کے بعد ان لوگوں کے اصرار پر کچھ کہتے اور کمرے میں لوٹ آنے کے بعد ان باتوں کو قلم بند کرتے۔ اس طرح شانتی نکیتن میں اپدیش دینے کی ابتدا ہوئی۔ شاعر نے دھرم سے متعلق جو باتیں اس طرح کہی ہیں وہ بعد میں ۱۷ جلدوں میں شائع ہوئے۔ جن میں سے اولین آٹھ جلدیں ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۲ء میں چھپیں........ "گیتانجلی" کے گیت بھی تقریباً ہر روز ایک دو لکھے جاتے رہے۔ گیتوں کی تخلیق کرتے، سُر دے کر گاتے، اسی طرح پوجا ہوتی........ پانچ ماہ اس طرح گزرے......" [1]

"گیتانجلی" کی تخلیق کے برسوں بعد خود رابندر ناتھ نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آیا، جب پے در پے رنج و غم سے نڈھال ہو کر ایسا محسوس ہوا تھا کہ زندگی کا سب کام پورا ہو چکا ہے اور اب میں ایک چراغِ سحری ہوں اب الیشور کا نام جپنے کے دن ہیں۔ لہٰذا اب سکونِ قلب اور ابدی امن کی منزل کو تلاش کرنا ہی واحد کام ہے......"

رابندر ناتھ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ پر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شریکِ حیات کا انتقال ۱۹۰۲ء میں

---

[1] بنگلہ کتاب "رابندر ناتھ کی جیون کہانی" از پربھات کمار مکھوپادھیائے۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۱ء صفحہ ۷۶۔ مزید تفصیلات کے لئے ان کی مفصل کتاب "حیات ٹھاکر" جلد ۱ دیکھئے۔

ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں بیٹی رینوکا، ۱۹۰۵ء میں والد اور ۱۹۰۷ء میں بیٹے شمی یندر ناتھ بھی چل بسے پے در پے ایسے غموں کا مقابلہ آسان نہیں ہے لیکن شاعر کے دل کی یہ حالت، یہ اُداسی اور پژمردگی بہت دلوں تک برقرار نہیں رہی اور نہ ہی شاعر طویل عرصہ تک شانتی نکیتن میں بھجن گانے میں مگن رہے شری پربھات کمار مکھوپادھیائے نے اس سلسلے میں لکھا۔

"آدمی ہمیشہ روحانیت میں مگن نہیں رہ سکتا چاہے دھیان کرے یا بھجن کرے ------ پانچ ماہ مسلسل شانتی نکیتن میں تقریباً ہر روز اُپدیش دیتے رہے لیکن شاعر کے لیے یہ ایک نئی زندگی، ایک نئی زندگی، اس ایک فکر کو ساتھ لئے اور ایک ہی مقام پر زیادہ دلوں تک ٹکنا نہایت تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ دھرم اُپدیش دینا ان کی عادت بن جا سکتی ہے اور اس کا نتیجہ ہمیشہ سننے والوں کے لیے مفید نہیں ہوگا اس خطرہ سے شاعر آگاہ تھا چنانچہ اس ماحول سے بچ نکلنے کے لئے وہ بے چین ہو گئے اور انہیں دلوں پھر ان کو باہر جانا پڑا۔"

ربندر ناتھ کی یہ حالت، دل و دماغ پر نا امیدی کے بادل زیادہ دلوں تک چھائے ہوئے نہیں رہے لیکن "گیتا نجلی" اس وقت کا ترجمان ہے پھر بھی یہ نہ سمجھا جائے کہ گیتا نجلی کے سب گیت اپنے دامن میں محض فراریت لئے ہوئے ہیں۔ صرف رنج و غم، مایوسی، نا امیدی، اداسی، ناکامی، بیکسی اور زندگی سے فرار کا درس ہی "گیتا نجلی" میں ہے۔ "گیتا نجلی" میں دکھ درد ضرور ہے لیکن مایوسی نہیں۔ لہذا اسے زندگی سے فرار نہیں بلکہ غم حیات کا ترجمان کہنا زیادہ درست ہے۔ "گیتا نجلی" کے گیتوں میں "بھارت تیرتھ" "غریب کا ساتھی، بے عزت، بیداری روح اور "خاکِ ہند" وغیرہ ایسے گیت ہیں جو یقیناً زندگی آموز ہیں اور اہم ہیں ملاحظہ ہو۔

"یہ عبادت، نغمہ و سرور
یہ تسبیح خوانی چھوڑ ـــــــ !
دروازہ بند کرکے
خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشہ میں تو کس کی پرستش کر رہا ہے ؟

دیکھ ترا خدا، ترے رُوبرو نہیں ہے — !

وہ، وہاں ہے
جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے
جہاں، سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے
وہ، ان کے ساتھ دھوپ اور بارش میں ہے
اور اس کا ملبوس خاک میں اٹا ہوا ہے

اپنے تخیّلات سے باہر آ،
ان پھولوں اور بخورات کو الگ رکھ دے
کیا ہرج ہے اگر تیرے کپڑے بوسیدہ و داغدار ہیں ؟
اُس سے مل
اور محنت و عرق پیشانی کے ساتھ
اس کے پاس آ کھڑا ہو

(ترجمہ، نیاز فتح پوری۔ صفحہ ۴۷-۴۶)

یہ میری پرارتھنا نہیں —— کہ
وقت مصیبت مجھے بچا لو
بلکہ میرا مدّعا ہے —— کہ
میں خطروں سے نہ گھبرا جاؤں

کوئی پُروا نہیں —— اگر تم

رنج وغم سے نڈھال دل کو، دلاسا نہ دو
صرف مجھے یہ ہمّت دو کہ میں
رنج وغم کا مقابلہ کر سکوں

("آنما تران" ۔۔۔ مجموعہ "گیتانجلی"۔ ترجمہ راقم الحروف)

۳

اے مرے بدنصیب وطن

....

تم نے جن کی بے عزّتی کی ہے
تمہیں بھی ان کی طرح بے عزّت ہونا ہوگا
سامنے آکھڑا ہونے پر بھی
جن کو تم نے انسانیت کے حقوق سے محروم رکھا ہے
تم کو بھی
ان کی طرح، بے عزّت ہونا پڑے گا

(نظم "اپمانیہ"۔ مجموعہ "گیتانجلی"۔ ترجمہ راقم الحروف)

سائنس کی ترقی نے آج دُور دُور کے ممالک کو قریب کردیا ہے اور آج کے دن مختلف ممالک کا سفر کئے بغیر بھی ہم ان ممالک کے سلسلے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ لیکن عہد ربندر ناتھ میں یعنی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک، ولایت ہم سے اتنا قریب نہیں تھا۔ ربندر ناتھ نے یورپ کا بار بار سفر کرکے ہندستان کے لئے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ ہے کہ یورپی ممالک خاص کر انگلستان کے باشندوں میں ہندستان کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں تھیں ان کو دُور کیا۔ عام طور پر ہندستان کے سلسلے میں یورپ کے عوام تاریکی میں تھے۔ عموماً وہ کچھ جانتے ہی نہیں تھے اور اگر کچھ جانتے تھے تو بیشتر غلط جانتے تھے۔ ایسی غلط باتیں جو انگریز حکمراں اپنے مفاد کی خاطر

غیر ممالک میں پرچار کرتے تھے مثلاً یہ کہ ہندستان کے باشندے بالکل جاہل ہیں، جنگلی ہیں، تہذیب و تمدن سے ان کا دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے وہ وحشی ہیں اور یہ کہ انگریز ان کو "آدمی" بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انگریزوں نے ہندستان کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ چونکہ انگریز روشن خیال اور انسان دوست ہیں۔ لہذا یہ انگریزوں کا قومی، اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ ہندستانیوں کو وہ "آدمی" بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

نوبل ادبی انعام یورپ کی کئی شخصیتوں کو مل چکا تھا لیکن ایک غلام ملک ہندستان کے باشندے کو ملنا جس کو وہ ہندو پوئٹ (Hindu poet) کے لقب سے جانتے تھے ان کے لئے حیرت انگیز واقعہ تھا۔ لہذا ۱۹۱۳ء میں رابندر ناتھ کو نوبل انعام ملنے پر یورپ کے تعلیم یافتہ سماج کی نظریں ہندستان پر جم گئیں۔ یورپ کے باشندے ہندستان کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا دلچسپ ذکر کرتے ہوئے محترمہ موئتر لیا دیوی اپنی مشہور تصنیف "وشوا سبھائے ربندر ناتھ" (عالمی محفل میں ربندر ناتھ) میں لکھتی ہیں کہ ربندر ناتھ کو نوبل انعام ملنے پر جرمن میں ایک کارٹون شائع ہوا تھا اس کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ تاڑ کے درخت پر پگڑی پہنا ہوا ایک ہندو بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں نوبل انعام کی سند ہے۔

پہلی بار جون ۱۹۱۲ء میں "گیتانجلی" کا ترجمہ لے کر ربندر ناتھ انگلینڈ گئے تھے۔ ایک کاپی میں چند نظموں کا ترجمہ انہوں نے روکھن آسٹائن کو دیا۔ یہی وہ مبارک دن ہے جس دن سے شاعر کا نام دنیائے ادب میں پھیلنے لگا۔ روکھن اسٹائن نے ربندر ناتھ سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے Men and Memories میں لکھا ہے کہ:-

"میں نے ایک انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ میں ایک افسانے کا ترجمہ کابلی والا پڑھا تھا جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ افسانہ نگار کا نام ربندر ناتھ ٹھاکر تھا۔ میں نے جوڑا سانکو کو خط لکھا کہ ربندر ناتھ کی چند اور کہانیاں ترجمہ کر کے روانہ کریں۔ چند دنوں بعد میرے نام ایک کاپی آئی۔ (اجیت چکرورتی کا ترجمہ کیا ہوا) اس میں چند نظمیں تھیں۔ نظموں کو پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ ان ہی دنوں پرمتھ لال سین سے میرا تعارف ہوا تھا۔ اور وہ ربندر ناتھ شیل کے ہمراہ میرے گھر آئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ

رابندر ناتھ کو لندن لے آئیں اور ایک خط بھی لکھا تھا اس کے بعد ایک دن معلوم ہوا کہ رابندر ناتھ لندن آئے ہیں پھر وہ میرے گھر آتے جاتے رہے۔ رابندر ناتھ نے اپنی نظموں (گیتانجلی) کے جو ترجمے خود کئے تھے وہ انہوں نے مجھے دیئے۔ میں نے نظموں کی اس کاپی کو شاعر ایٹس کے حوالے کیا۔ شاعر ایٹس ان نظموں کے مطالعے سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ خود اپنے گاؤں سے رابندر ناتھ سے ملنے لندن آیا۔ چند روز میں رابندر ناتھ کا تعارف لندن کے اہلِ علم و قلم سے ہوا۔ ۱۲ جولائی کو جو استقبالیہ دیا گیا تھا اس جلسے کی صدارت خود ملک الشعراء ایٹس نے کی تھی۔"

آج کے دور کے کئی ادباء و شعراء کا خیال ہے کہ رابندر ناتھ نے جو ترجمے کئے تھے وہ معیاری نہیں ہیں اور ان کی زبان میں کئی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے ایسی باتوں میں کچھ صداقت ہو۔ انگریزی رابندر ناتھ کی اپنی زبان نہیں تھی اور انگریزی میں خیال کی درست ترجمانی کا انہوں نے کبھی دعوا بھی نہیں کیا ہے۔ رابندر ناتھ نے خود لکھا ہے ـــــ "انگریزی زبان کے صدر دروازے کی چابی میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مجھے اُچک اُچک کر راستے کی دیواروں کو پھاندنا پڑتا ہے اور اس طرح راستہ چلنا ایک ورزش ہے۔" لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری کی موسیقیت، شگفتگی، حسن، روحانی کیفیت، احساسات کی گہرائی اور اندازِ بیان کا نیا پن، چند ایسی خصوصیات تھیں جس نے اس عہد میں یورپ کا دل جیت لیا۔

رابندر ناتھ ٹھاکر کو نوبل انعام ملنے پر دنیا پر یہ روشن ہوا کہ دنیا کے ہر ملک میں، ہر قوم میں، ہر زبان میں، ہر رنگ و نسل میں عظیم انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ سامراجی ممالک کی کوئی جاگیر نہیں ہے کہ ان کے دیش ہی میں عظیم انسان ہوں گے اور یہ بھی کہ طاقت کے بل پر، ظلم و ستم کے بل پر، سامراجیت کی قوت کسی قوم کو صرف کچھ عرصہ تک ہی دبائے رکھ سکتی ہے، ہمیشہ کے لئے نہیں۔ دنیا کے وہ ممالک جو ہمارے ملک کے سلسلے میں بالکل بے خبر تھے، لاعلم تھے، تاریکی میں تھے، وہ جو ہمیں جاہل اور وحشی ہی جانتے تھے۔ ان سب کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے جانا کہ غلام ہندستان میں بھی انسان ہیں اور یہ ملک بھی ایک تہذیب و تمدن کا مالک ہے۔ ●●

"سر" کا خطاب پانا اور لوٹا دینا

ہر دور کے حاکم اپنے وفاداروں کو انعامات اور خطابات سے نوازتے رہے ہیں۔ انگریز بھی یہی کرتے رہے۔ برٹش دور حکومت میں سالانہ دو بار خطابات کی تقسیم ہوتی تھی ایک بادشاہ کے جنم دن پر (King's Birth day) اور دوسرا یوم نیا سال کے موقع پر۔ انگریز حکمران انعامات و خطابات کی تقسیم میں خوب ہوشیاری سے کام لیا کرتے تھے سب سے پہلے وہ اس بات کی خوب چھان بین کر لیتے کہ وہ جن کو انعام سے نوازتے رہے ہیں وہ حکومت کے وفادار ہیں یا نہیں انگریزوں کی پالیسی "پھوٹ ڈالو" اور حکومت کرو" رہی ہے وہ خطابات کی تقسیم میں بھی اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ خطابات مقرر کئے تھے ہندوؤں کو رائے صاحب، رائے بہادر، راجہ، مہاراجہ بہادر کے خطابات دیتے تو مسلمانوں کو خان صاحب خان بہادر، نواب اور نواب بہادر کے خطابات۔ ایسے کسی ہندو کو انگریزوں نے کوئی خطاب نہیں دیا جس میں انگریز مخالف بو بھی ہو۔ اسی طرح کسی ایسے مسلمان کو بھی خطاب نہیں دیا گیا جس کے دل کے کسی کونے میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا کوئی جذبہ پایا گیا ہو پھر وہ خطابات دیتے وقت ہندو اور مسلمانوں میں توازن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہے تاکہ دونوں خوش رہیں۔

شاہ جارج کی طرف سے وائسرائے ہند نے ۱۹۱۵ء میں ربندر ناتھ ٹھاکر کو "سر" کا خطاب دیا۔ یہ اس لئے نہیں کہ ربندر ناتھ انگریز دوست یا انگریز پرست تھے۔ یا ہندستان میں انگریزوں کی حکومت کے وہ طرفدار تھے۔

نوبل انعام اور "سر" کا خطاب پانے سے بہت قبل ہی ربندر ناتھ کے مضامین اور شاعری سے بے شمار مثالیں ایسی دی جا سکتی ہیں جس سے واضح ہے کہ ٹھاکر انگریزوں کا اصلی

پڑھ دیکھ چکے تھے اور انہوں نے سامراجیت کو جان لیا تھا۔ رابندر ناتھ پہلی بار ولایت کا سفر کرکے فروری ۱۸۸۰ء میں لوٹے تھے جب ان کی عمر صرف ۱۸ برس کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپی تہذیب، تعلیم، وہاں کی آزادیٔ نسواں، آرٹ، موسیقی، ادب اور سائنس کی ترقی وغیرہ نے ان کو متاثر کیا تھا۔ وہاں کے عوام کے سماجی اور سیاسی شعور سے بھی وہ متاثر ہوئے تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود انگریز سامراجیت کی پالیسی اور دیگر ممالک کو لوٹنے اور غلام بنائے رکھنے کی چالوں کے وہ ابتدا ہی سے سخت مخالف رہے ہیں۔ بنگلہ سن ۱۲۸۸ مطابق ۱۸۸۱ء میں انہوں نے سامراجیت کا اصل روپ دیکھ لیا تھا، پہچان لیا تھا۔ "چین میں موت کی تجارت" کے عنوان سے رسالہ "بھارتی" میں انگریز سامراجیوں نے کس طرح ملک چین کو لوٹا پر بھرپور طنز کرتے ہوئے رابندر ناتھ نے لکھا ہے[۱]

"ایک پورے ملک کے باشندوں کو دولت کمانے کے لالچ میں کس طرح زہر پلایا گیا ہے ایسی بھیانک اور بے رحم بات کبھی سنی تک نہیں گئی۔ ملک چین نے رو رو کر کہا ——— "میں افیون نہیں کھاؤں گا"۔ انگریز تاجر نے کہا ——— "یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟ اور پھر چین کے دونوں ہاتھ باندھ کر، اس کے منہ میں کان سے ٹھونس ٹھونس کر افیون کھلائی گئی اور اس طرح افیون کھلانے کے بعد کہا گیا "جو افیون کھائی ہے اس کی قیمت دو"۔ ایک زمانے سے انگریز چین میں یہ عجیب و غریب تجارت چلا رہے ہیں ——— رفتہ رفتہ دیکھا گیا کہ یورپ کے باہر دیگر ممالک میں یورپی تہذیب روشنی یا اجالے کے لئے نہیں بلکہ ان ممالک میں آگ لگانے کے لئے روشن کی گئی ہے اسی لئے ایک دن توپ کے گولے اور افیون کے بنڈل دونوں ایک ساتھ چین پر پھینکے گئے۔ آج تک کی تاریخ میں اتنا بھیانک بربادی کا کھیل کبھی کھیلا نہیں گیا ہے۔"

یہ تو ملک چین کے سلسلے میں ہے۔ انگریز ہندستانیوں کی جس طرح سے بے عزتی کرتے

---

[۱] اقبال، ٹیگور اور نذرل تین شاعر ایک مطالعہ۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ صفحہ ۴۱-۴۰

تھے اس کے خلاف بھی رابندر ناتھ نے بار بار لکھا ہے مثلاً انگریزی اخبار "انگلش مین" نے ہندستانیوں سے کیسا برتاؤ کیا جائے پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "Kick them first and then speak to them" یعنی ان کو پہلے لات مارو اور پھر بات کرو۔ اس جملے نے رابندر ناتھ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ وہ ایسی بے عزتی کو برداشت نہیں کر پائے۔ جب کہ اس دور کے کسی نامی گرامی ہندستانی نے اس کے خلاف لب نہیں کھولا۔ رابندر ناتھ نے جب دیکھا کہ پورے ملک میں ایک ہندستانی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی مخالفت میں کچھ کہے تو انہوں نے رسالہ "بھارتی" (ماہ جیٹھ ۱۲۸۸ بنگلہ سن مطابق ۱۸۸۱ء) میں "جوتے کی تجارت" نامی مضمون لکھا اور انگریزوں پر سخت طنز کیا۔ کانگریس کے ابتدائی دور میں کلکتہ "ٹاؤن ہال" کے ایک جلسہ میں چند انگریز تقریر کر رہے تھے اور بڑے بڑے ہندستانی رئیس ان کی تقریر کی خوب داد دے رہے تھے ان انگریزوں اور ایسے انگریز پرست ہندستانیوں کے خلاف "ٹاؤن ہال میں تماشہ" کے عنوان سے (۱۸۸۲ء) رابندر ناتھ نے لکھا[1]

> "اس دن ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا تماشہ ہوا۔ دو تین انگریز امید کی ڈگڈگی بجا رہے تھے اور اس امید کی ڈگڈگی سے خوش ہو کر اس ملک کے کئی بڑے بڑے لوگ سر پر بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ناچ رہے تھے۔ جو لوگ ہمارے ملک کی بے عزتی کرتے ہیں، ملک کا کوئی باوقار فرزند ان لوگوں سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ صرف ذرا سی سہولت کی امید پر جو لوگ بیستی کھول کر ان سے رشتہ کرنے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو دیکھنے پر بھی نفرت ابھر آتی ہے۔"

کبھی کبھی حکومت ایسے کام کو کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے جو اس کی پالیسی کے خلاف ہو اور رابندر ناتھ کو "سر" کا خطاب دینے پر بھی انگریزی حکومت مجبور ہوئی تھی۔ رابندر ناتھ کو دنیا کا سب سے بڑا ادبی انعام (نوبل انعام) ملنے پر انگریزی حکومت اپنی عزت بچانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ان کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بھی اپنی علم دوستی اور قدردانی کا مظاہرہ کریں۔ لہٰذا ۱۹۱۵ء میں برٹش حکومت نے رابندر ناتھ کو "نایٹ ہڈ" دیا۔ اور "سر" کا اعلیٰ خطاب۔ انگریزی دور حکومت میں یہ

---

[1] اقبال، ٹیگور اور نذرل تین شاعر ایک مطالعہ۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ صفحہ ۴۳

پہلا واقعہ ہے جب حکومت "وفاداری اور فرماں برداری" کے سوال کو بالائے طاق رکھ کر کسی کو خطاب دینے پر مجبور ہوئی تھی نوبل انعام پانے کے بعد ربندر ناتھ کو "سر" کا خطاب ملنے پر حقیقی معنوں میں ان کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ انگریزی حکومت نے اپنی ناک رکھ لی بالکل اسی طرح جس طرح کلکتہ یونیورسٹی نے ربندر ناتھ کو نوبل انعام ملنے کے بعد اعزازی ڈی۔ لٹ کی سند دیکر اپنی عزت بچائی تھی، جب کہ نوبل انعام ملنے سے چند سال پہلے ربندر ناتھ کو ڈاکٹریٹ کی سند دینے کی تجویز کو کلکتہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ ربندر ناتھ بنگلہ زبان تک غلط لکھتے ہیں۔ لہذا ادب میں نوبل انعام پانے کے بعد ٹھاکر کو جو دیگر انعامات و خطابات ملے اس کی اہمیت اس لحاظ سے کم ہے۔ وہ انعامات ایک حد تک ربندر ناتھ کی خدمات کا اعتراف نہیں بلکہ انعام دینے والوں کی اپنی عزت کا سوال بن گئے تھے۔

ربندر ناتھ کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ انگریزی حکومت (شاہ جارج) کی طرف سے "سر" کا خطاب پانے کے بعد بھی ٹھاکر نے کبھی ہندستان میں انگریزوں کے ظلم و ستم اور دنیا میں سامراجیت کے مظالم کی ذرہ برابر بھی طرفداری نہیں کی ہے، بلکہ وہ ہر نا انصافی کے خلاف کھل کر لکھتے رہے اور ہندستانی عوام کی جنگِ آزادی میں نہ صرف وہ عوام کے ساتھ رہے بلکہ ایسے نازک وقت پر جب ملک کے نامور سیاسی رہنما بھی پیچھے ہٹ گئے ربندر ناتھ نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ کبھی کسی ایسی بات کو تسلیم نہیں کیا جسے وہ غلط سمجھتے تھے اور کبھی حق کہتے ہوئے نہیں ہچکچائے اور جو کچھ کہا صاف صاف کہا، ڈنکے کی چوٹ پر کہا۔
ربندر ناتھ نے صرف ظلم کرنے والوں کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ وہ ان بے شرم "بڑے" لوگوں سے بھی سخت نالاں تھے، ان لوگوں سے بھی دل کی گہرائیوں سے نفرت کرتے تھے، جو ظالم کے خلاف نا انصافی کے خلاف، لب کھولنے سے ڈرتے تھے اس سلسلے میں ان کے ایک مشہور شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

" وہ، جو نا انصافی کرتے ہیں
اور وہ، جو نا انصافی کو سہتے ہیں
تمہاری نفرت کی آگ

ان دونوں ہی کو

خس کی طرح جلا کر راکھ کر دے۔"

حقیقت یہ ہے کہ کوئی عزت، کوئی انعام، کوئی خطاب، کوئی لالچ رابندر ناتھ کو مجبور نہیں کر سکا کہ وہ کسی ناواجب بات کو تسلیم کرلیں یا راہ حق و انصاف سے ہٹ جائیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال رابندر ناتھ کا انگریزی حکومت کو "سر" کا خطاب واپس کر دینا ہے۔ یہ قدم تاریخ آزادیٔ ہند میں ایک ایسا واقعہ ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے اور جس کی کوئی اور مثال ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں پائی نہیں جاتی۔ آج، آزادی کے برسوں بعد ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ غلامی کے اس دور میں برٹش حکومت کا دیا ہوا خطاب "سر" کو لوٹا دینا کتنی جرأت، شجاعت، دلیری اور بہادری کا کام رہا ہے۔ اُن دنوں یہ کام بڑے ہی دل گردہ کا کام تھا۔ نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بے عزتی، گرفتاری، مال و جائداد کی ضبطی، جلاوطنی، ظلم و ستم، طرح طرح کی سزائیں، جیل، عمر قید یا اس سے بھی بھیانک کچھ اور —— لیکن مادرِ ہند کا بہادر سپوت، ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنے والا حق پرست عظیم فنکار، کب اور کیسے اپنے وطن والوں کی بے عزتی کو برداشت کر سکتا تھا۔ لہذا ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں نہتے ہندستانیوں کے قتل عام پر وہ خاموش تماشائی بنے نہیں رہے اور انہوں نے سخت ترین الفاظ میں وائسرائے ہند کے نام ایک خط لکھ کر "سر" کا خطاب حکومت کو لوٹا دیا۔ وہ خط ایک تاریخی خط ہے۔

آج بھی بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ کن حالات کے تحت رابندر ناتھ نے "سر" کا خطاب لوٹا دیا تھا۔ اس دور میں نہ صرف حکومت نے اس کی کوشش کی کہ رابندر ناتھ کے اس دلیرانہ اقدام کا ذکر کہیں نہ آنے پائے بلکہ موقع پرست اور مفاد پرست سیاسی رہنماؤں تک نے اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر خیال کیا۔ لہذا یہاں اس کا مختصر ذکر ضروری ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ رابندر ناتھ کتنے عظیم وطن پرست، انسان دوست، مظلوموں کے ساتھی اور نڈر حق پرست تھے۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں تفصیلات کے لئے دیکھئے، چن موہن سہانویش کا انگریزی مضمون پندرہ روزہ رسالہ ویسٹ بنگال کلکتہ، رابندر ناتھ ٹھاکر نمبر ۹ مئی ۱۹۸۴ء اور پروفیسر پرسانت چندر اہلانویش کا بنگلہ مضمون ہفتہ وار "دیش" کلکتہ کے پوجا نمبر سنہ ۱۹۶۱ء میں۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جو تاریخی جلسہ ہوا تھا وہ مقام جلیانوالہ باغ کیسا تھا کے سلسلے میں بابو بینی پرشاد لکھتے ہیں [1]

"باغ تو وہ محض برائے نام ہی ہے۔ "جلے" اس فرقے کا نام ہے جس سے اس باغ کے مالک کا تعلق تھا اور "والا" اضافت تخصیص سے یہ باغ ایک کھلا ہوا میدان ہے جس کے چاروں طرف مکانات ہیں ——— یہ ایک بے جوڑ اور غیر ہموار چوگوشہ مقام ہے جو جگہ جگہ دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور اکثر جگہ مکانات کے پشت کی دیواریں اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس چوگوشہ مقام پر کچھ درخت بھی لگے ہیں اور اس میں ایک شکستہ مقبرہ بھی ہے جس کے قریب ہی ایک کنواں ہے باغ کا صدر دروازہ تنگ ہے اور اسی لئے خوش قسمتی سے مسلح موٹریں اس میں سے نہ گزر سکیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی صدر دروازہ نہیں ہے البتہ چار پانچ مقام پر گزرنے کے تنگ راستے ضرور تھے۔ باہر جانے کا جو راستہ ہے وہاں زمین کسی قدر بلند ہے اور یہاں سپاہیوں کو بٹھانے اور سامنے مجمع پر گولیاں چلانے کا بہت اچھا موقعہ ہے اس حالت میں جب جنرل ڈائر اپنے نوّے (۹۰) سپاہیوں کے ساتھ باغ میں داخل ہوئے تو لوگوں کے لئے وہاں سے چلے جانے کا کوئی آسان راستہ نہ تھا۔"

یہی وہ باغ ہے جہاں انگریز جنرل ڈائر نے فوج بٹھا کر جلسہ میں شریک ہونے والے بے شمار ہندستانیوں پر گولیاں چلا کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ عوام جس جانب بھاگتے اسی طرف نشانہ کرتے ہوئے گولیاں چلائی جاتیں اس طرح باغ نہتے عوام کی لاشوں سے بھر گیا۔ صرف یہی نہیں

---

[1] حقیقت تہلکہ پنجاب۔ از بابو بینی پرشاد سنگھ بھٹناگر، مطبوعہ میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ۔ سن اشاعت درج نہیں۔ صفحہ نمبر ۲۳۔

بلکہ اس کے بعد بھی امرتسر کی جنگی عدالت نے فیصلہ کرکے ۵۱ لوگوں کو پھانسی، ۴۶ کو تاحیات ملک بدر اور ۱۱۶ لوگوں کو دس تا پندرہ سال کے لئے جیل کی سزائیں دی تھیں۔ عورتوں پر بھی ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے ان سب لوگوں کا بس یہی قصور تھا کہ وہ آزادی کے طالب تھے۔ اور جلیانوالہ باغ کے جلسۂ عام میں شرکت کرنے گئے تھے ان دنوں سخت سنسر شپ کے باوجود اخبارات میں جو کچھ خبریں چھپ سکی تھیں اس کا ردعمل ملک بھر میں ہوا تھا۔ کلکتہ میں جو جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے اس پر بھی پولیس نے گولیاں چلائیں جس کے نتیجہ میں (اخبارات کے مطابق) پولیس کی گولیوں سے چھ آدمی مرے اور کم از کم ۱۲ زخمی ہوئے تھے۔ ہندستان کے دیگر شہروں کے علاوہ بنگال کے دیہی علاقوں میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ وطن کی ایسی حالت پر "وطن پرست اور انسان دوست شاعر رابندرناتھ ٹھاکر کیوں کر خاموش رہتے۔"

وائسرائے ہند کو "سر" کا خطاب لوٹا دینے کے سلسلے میں اپنا تاریخی خط لکھنے سے پہلے ٹھاکر نے ہر طرح کوشش کی تھی کہ جلیانوالہ باغ میں جو کچھ ہوا ہے اس کے خلاف ہندستان کا کوئی نامور سیاسی رہنما بھرپور احتجاج کرے۔ انہوں نے ذاتی طور پر گاندھی جی کی خدمت میں اپنے ساتھی اینڈروز کو روانہ کیا تھا۔ ان دنوں صوبہ پنجاب میں کسی کا داخلہ بند کردیا گیا تھا۔ شاعر نے گاندھی جی کو یہ تجویز بھیجی کہ اگر وہ تیار ہوں تو وہ خود ان سے دہلی میں جا کر ملیں گے اور وہاں سے دونوں مل کر پنجاب جائیں گے ایسی حالت میں وہ گرفتار کرلئے جائیں گے اور یہ گرفتاری احتجاج کا ایک اچھا نمونہ ہوگا۔ اینڈروز یہ تجویز لے کر گاندھی جی سے ملنے گئے۔ دوسری طرف کلکتے میں شاعر پر ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ وہ نہایت بے قراری سے اینڈروز کے لوٹ آنے کے منتظر تھے اور آخر کار گاندھی جی سے مل کر اینڈروز لوٹے۔ ان کے آتے ہی تمام کام چھوڑ کر بیقراری سے شاعر نے پوچھا — "کیا خبر؟ ہم کب روانہ ہو سکتے ہیں۔؟" اینڈروز خاموش رہے اور کچھ دیر بعد خاموشی توڑتے ہوئے اینڈروز نے شاعر کی صحت کے سلسلے میں پوچھا۔ "بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ اپنی صحت کے سلسلے میں کہئے —؟" لیکن رابندرناتھ نے پھر بے چینی سے سوال کیا "کیا ہوا —؟" اور آخر جب اینڈروز نے بتایا کہ گاندھی جی اس وقت پنجاب جانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ اس وقت وہ حکومت کو کسی الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ یہ بات شاعر پر برق سی گری اور شاعر خاموش ہوگیا۔

اس کے بعد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر پرسانت مہلا نویش لکھتے ہیں کہ شاعر نے پانی ہتی سے جوڑا سانکو لوٹ جانے سے پہلے صرف اتنا کہا — "کل آپ تشریف مت لائیے —" اس پر جب انہوں نے پوچھا — "کیوں — ؟" تو شاعر نے کہا — "آپ کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میں آپ سے یہ التجا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری بات رکھیں گے —" میں نے دیکھا شاعر بے حد الجھن میں ہیں، پریشان ہیں اور میں بھی خاموش ہو گیا — پھر آگے چل کر مہلا نویش لکھتے ہیں — "اس رات میں سو نہ سکا۔ تب تک صبح نہیں ہوئی تھی۔ کوئی چار بجے ہوں گے۔ میں اٹھا، نہایا اور باہر نکل پڑا۔ ہماری گلی میں گیس کی بتیاں روشن تھیں۔ جوڑا سانکو (رابندر ناتھ کا مکان) مکان کی دوسری منزل میں چراغ روشن تھا — میں نے دربان کو جگایا اور سیڑھیوں سے اوپر چلنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے کھڑکی سے شاعر کے کمرے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ شاعر اپنے ٹیبل پر بیٹھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ پورب کی طرف منہ کئے بیٹھے تھے اور ٹیبل پر چراغ جل رہا تھا۔ باہر پوربی آکاش پر صبح کی اولین سرخی بکھرنے لگی تھی لیکن کمرے کے اندر ابھی تاریکی تھی میرے داخل ہوتے ہی شاعر نے کہا — "تو آپ آگئے" — اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گئے، لیکن دو چار منٹ بعد انہوں نے مجھے چند کاغذات دیئے اور کہا — "پڑھیئے" — اور یہی وائسرائے کے نام ان کا خط تھا۔ "سر" کا خطاب لوٹا دیتے ہوئے — شاعر نے کہا — "رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ اور اب آخر یہ سب کچھ ختم ہوا۔ جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ گاندھی جی پنجاب جانے کو تیار نہیں ہوئے۔ کل میں خود چترنجن (داس) کے ہاں گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ ناقابل برداشت ہے کہ پورا ملک اس نازک موقعہ پر خاموش تماشائی بنا رہے آپ ایک احتجاجی جلسہ طلب کیجئے، میں نے خود یہ تجویز رکھی کہ میں صدارت کرنے کو تیار ہوں۔ چتّا (چترنجن داس کا مختصر نام) نے کچھ سوچ کر کہا — اگر آپ صدارت کرتے ہیں تو پھر کسی اور کی تقریر ضروری نہیں ہے۔ آپ ہی کافی ہیں —" میں نے کہا جیسا تم چاہو، لیکن جسٹہ رذربلانہ اس پر وہ بولے — "چونکہ آپ ہی صدر ہوں گے اور آپ ہی مقرر اس لیے جلسہ بھی آپ طلب کیجئے —" بہرحال ان کی باتوں سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے۔ لہٰذا میں نے کہا — "بہتر ہے، مجھے ذرا سوچنے دیجئے —" اور یہ کہہ کر واپس چلا آیا۔ یہ ناقابل برداشت ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے — یہ خیال کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے میرے دل میں کانٹے کی طرح

چبھتا رہا اور اگر مجھے ہی کچھ کرنا ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں اپنے دل کی بات کہہ دوں۔"

"اس وقت تک صبح ہو گئی تھی اور انڈریوز بھی کمرے میں آ گئے تھے شاعر نے خط ان کو دکھایا۔ شاعر نے کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا حتیٰ کہ اپنے بیٹے رتھن درناتھ سے بھی نہیں اس ڈر سے کہ شاید ایسا قدم اٹھانے پر انہیں کوئی ٹوکے گا، روکے گا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس اقدام کے معنی گرفتاری ہو سکتی ہے۔ عدالتی کارروائی ہو سکتی ہے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت مقدمہ چل سکتا ہے، جیل کی سزا ہو سکتی ہے۔ انڈریوز نے خط پڑھنے کے بعد صرف اتنا کہا تھا کہ خط کے الفاظ ضرورت سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں، کیا کچھ نرم نہیں کئے جا سکتے؟ شاعر نے یہ سن کر ایسی غضبناک نگاہوں سے انڈریوز کی طرف دیکھا تھا کہ شاعر کی ویسی نگاہیں میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔"

خطاب "سر" کی واپسی اور اس سلسلے میں وائسرائے کے نام اس تاریخی خط کا کتنا زبردست اثر ہوا تھا وہ ایک اور داستان ہے لیکن ان دنوں کانگریس کے کرتا دھرتا ربندر ناتھ کے اس اقدام سے خوش نہیں ہوئے تھے۔ ربندر ناتھ نے یہ کوشش کی تھی کہ امرتسر کانگریس کے اجلاس میں ان کے "سر" خطاب اور وائسرائے کے نام خط کا ذکر آ جائے۔ اس کام کے لئے اینی بیسنٹ ہوم کو جو اس اجلاس کے مندوبین اور سبجیکٹ کمیٹی کے رکن تھے اور ٹھاکر کا خوب احترام کرتے تھے، انہوں نے تیار کیا تھا۔ اینی ہوم نے سبجیکٹ کمیٹی میں اس موضوع کو اٹھانے اور اجلاس میں اسے لانے کی پوری کوشش کی تھی انہوں نے اس سلسلے میں کھل کر لکھا بھی ہے لیکن ان کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا گیا۔ صدر پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، سید حسین، جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح۔ (یاد رہے کہ جناح ان دنوں کانگریس میں تھے) سب سے اینی ہوم پارٹی سے ملے تھے اور انہوں نے کوشش کی تھی لیکن کوئی بھی کانگریس اجلاس میں ربندر ناتھ کے اس اقدام کی تائید کرنے یا صرف "سر" کا خطاب لوٹا دینے اور وائسرائے کے نام خط لکھنے کا تذکرہ چھیڑنے کے لئے راضی نہیں ہوا۔

ٹھاکر نے "سر" کا جو خطاب واپس کیا اس سلسلے میں کامریڈ مظفر احمد نے لکھا ہے۔

"حکومت برطانیہ کی جانب سے اہل پنجاب پر اس تشدد اور ان کی اہانت پر ربندر ناتھ ٹھاکر اپنے "سر" کے خطاب سے جو شاہ برطانیہ کی جانب سے عطا ہوا تھا دست بردار ہو گئے۔ انہوں نے اس بارے میں وائسرائے کو جو خط لکھا اس کی زبان بے مثال تھی۔ ربندر ناتھ ٹھاکر کی خطاب سے دست برداری

نے جو بین الاقوامی سنسنی پیدا کی اس نے اہل برطانیہ کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
گاندھی جی نے جو کچھ کہا اس میں کتنا بڑا تضاد تھا۔ گاندھی جی نے لوگوں کی توقعات کو بلند کیا اور
پھر انجام کار انہیں بے سہارا چھوڑ دیا۔ ــــــ" [۱]

امرتسر کانگریس (۱۹۱۹ء) کی پوری کاروائی میں رابندر ناتھ کے اس اقدام کا ذکر نہیں کیا گیا۔
صرف یہی نہیں بلکہ بعد میں بھی کانگریس نے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر پی سیتارامیا کی
"تاریخ کانگریس" گاندھی جی کی "Story of my experiments with truth"
حتیٰ کہ جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح میں بھی رابندر ناتھ کے اس اقدام کا ذکر پایا نہیں جاتا۔ اس
واقعہ کے برسوں بعد ۱۹۲۴ء میں چرخایا "Cult of Charka" کے عنوان سے رابندر ناتھ نے
ایک مضمون لکھا تھا جس سے گاندھی جی ناخوش ہوئے تھے انہوں نے جواباً "young India"
مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۲۴ء میں "شاعر اور چرخا" کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس میں شاعر کے نام کے
ساتھ خطاب "سر" کا استعمال کیا تھا جس پر رسالہ ماڈرن ریویو (دسمبر ۱۹۲۵ء) نے لکھا کہ
مہاتما جی نے شاعر کا نام سر رابندر ناتھ ٹھاکر لکھا ہے غالباً وہ نہیں جانتے کہ ایک عرصہ ہوا شاعر
نے اس خطاب کو ترک کر دیا ہے ــــــ ۱۹۲۶ء میں رابندر ناتھ ٹھاکر نے اس کا ذکر کرتے ہوئے
لکھا ــــــ" [۲]

> "میرے نائٹ ہڈ" (سر کا خطاب) ترک کر دینے کے سلسلے میں پھر سے
> بحث ہونے لگی ہے اس سلسلے میں میں سمجھتا ہوں کہ عوام کے سامنے مجھے
> اپنی بات صاف کہنی چاہیئے۔ یہ تو واضح ہے کہ جلیانوالہ باغ میں قتل عام
> کے خلاف نہایت سخت نفرت کا اظہار کرنے کے لئے ہی میں نے لارڈ چیمسفورڈ
> کو خط لکھ کر خطاب واپس لے لینے کو کہا تھا۔۔۔۔۔۔ میں لوگوں کے سامنے

---

[۱] "میں اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی" از کامریڈ مظفر احمد۔ مترجم سالک لکھنوی۔ نیشنل بک ایجنسی۔ کلکتہ ۲،
صفحہ نمبر ۱۸۔

[۲] بنگلہ تصنیف "وشوا سبھائے رابندر ناتھ" از مُوتریا دیوی، پہلا ایڈیشن بنگلہ سن ۱۳۶۷ مطابق
۱۹۶۰ء۔ صفحہ نمبر ۱۶۱۔

کوئی ایسا کام کرنا پسند نہیں کرتا جس میں ذرہ برابر ناٹک (ڈراماپن)
ہو۔ لیکن ان دنوں خاص کر اس سلسلے میں مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا جب
کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی کوئی سیاسی رہنما سے پنجاب میں جو کچھ ہوا تھا
اس کے خلاف خاطر خواہ احتجاج کروانے میں ناکام ہوا تھا ـــــــ"

بہر حال ہندستان کی تاریخ میں شاعر رابندر ناتھ کا "سر" کا خطاب ترک کرنا، ہماری جنگ آزادی کا ایک ناقابلِ فراموش وطن دوستی کا انمول نمونہ ہے اور شاعر نے یہ قدم اٹھا کر ہندستانی عوام کی لاج رکھ لی تھی اور یہ واضح کیا کہ حقیقی فنکار کا کام تمام تر ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر حقیقت کا بھرپور ساتھ دینے میں نڈر ہونا ہے۔

کسان مزدور اور شاعر

اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ ہمارے عظیم عوامی شاعر ربندر ناتھ ٹھاکر کو مفاد پرست اور بورژوا دانشوروں نے محض ایک روحانی شاعر، صوفی صفت شاعر، مناظر قدرت اور حسن کا متوالا شاعر، میٹھے میٹھے مدھر گیت گانے والا شاعر، لوریاں سنا سنا کر اور تھپک تھپک کر ہمیں نیند کی دنیا میں لے جانے والا شاعر، اور بھگوان کے چرنوں میں اپنے گیتوں کے پھول، عقیدت کے پھول نچھاور کرنے والا شاعر کے طور پر ابھار کر پیش کیا ہے۔ ہمارے ایسے دانشور ربندر ناتھ کے کلام اور دیگر تخلیقات میں محض عشق مجازی اور عشق حقیقی، رومانیت، روحانیت، ترک دنیا اور ترک نفس وغیرہ کو تلاش کرتے ہیں۔ گویا ربندر ناتھ شاعر نہیں، مہاتما گوتم بدھ تھے۔ سادھو، سنیاسی تھے، جو سنسار سے بھاگ کر، جپ تپ کرنے کے لئے جنگل اور پہاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ یہ نقاد اور دانشور ربندر ناتھ کے کلام کی مٹھاس، ترنم اور حسن سے ہمیں آشنا کرتے رہتے ہیں۔ یہ دانشور کلام ٹھاکر کی ایسی شرح و تفسیر بیان کرتے ہیں گویا شاعر اس دھرتی کا انسان نہیں تھا، اس زمین سے، یہاں کے لوگوں سے [illegible]، لوگوں کے مسائل سے، غربت سے، افلاس سے اور پھر زندگی کے لئے، آزادی کے لئے عوامی جدوجہد سے، شاعر کا کوئی لگاؤ نہیں رہا ہے۔ لہٰذا آج کی اہم ضرورت ربندر ناتھ کا از سر نو مطالعہ ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ زندگی سے کتنے قریب تھے، ملک اور عوام سے ان کا کتنا گہرا لگاؤ تھا! اور انہوں نے اپنے ملک کے لوگوں کے لئے، یہاں کی اکثریت کے لئے یعنی محنت کشوں کے لئے، کیا کیا ہے؟ ان کی جدوجہد زندگی میں کس طرح ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ربندر ناتھ ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ ذاتی

زندگی میں ان کو غربت اور بھوک کا کوئی تجربہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن تاریخ ادب میں غالباً اس سے زیادہ حیرت انگیز اور کوئی واقعہ نہیں ہے کہ خود اتنے رئیس اور بڑے زمیندار گھرانے کا فرد ہوتے ہوئے بھی انہوں نے زمینداروں کے مظالم کے خلاف صاف آواز اٹھائی، پُرزور آواز بلند کی۔ کسانوں اور محنت کشوں کی بھرپور طرفداری کی اس اعتبار سے رابندر ناتھ بہت بڑے باغی شاعر تھے۔ ایک شاعر جس نے خود اپنے طبقے کے خلاف بغاوت کی ہے ایک عرصہ تک رابندر ناتھ کو اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کا کام خود کرنا پڑا یہی وہ زمانہ ہے جب انہوں نے دیہی بنگال کو قریب سے دیکھا۔ کسانوں سے قریب ہوئے اور کسانوں کے دکھ درد کو جاننے اور ان کے دلوں کو ٹٹولنے کا انہیں بھرپور موقع ملا۔

اپنے زمیندار طبقے سے بغاوت اور کسانوں سے ہمدردی کے سلسلے میں ان کی پہلی اور بے مثال نظم "دو بیگھہ زمین" کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ کئی پہلوؤں سے یہ طویل نظم نہ صرف بنگلہ ادب بلکہ پورے ہندستانی ادب میں ایک تاریخی نظم ہے یہ نظم ایک نئے دور کی علم بردار ہے رابندر ناتھ نے یہ نظم بنگلہ سنہ ماہ جیٹھ ۱۳۰۲ یعنی ۱۸۹۶ء کے آخر آخر میں لکھی تھی۔ اس دور میں جب ترقی پسند ادب یا ادبی تحریک وغیرہ نامی کوئی خیال تک نہیں ابھرا تھا۔ ہندستان کی تاریخ ادب میں اس سے قبل کسانوں پر مظالم، زمینداروں کی لوٹ، کسانوں کی مجبوری اور بے بسی پر ایسی کوئی نظم نہیں لکھی گئی اس نظم کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ زمیندار رابندر ناتھ کھل کر اپنے مظلوم کسانوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے تھے اور یہ کسان اب محض ان کے پرجا یا رعایا نہیں رہے بلکہ ان کے اپنے ہو گئے تھے زمیندار رابندر ناتھ یہاں کسان بن گیا ہے معمولی ہندستانی کسان جو زمینداروں کے ظلم سے تھر تھر کانپتا ہے، جو سود خور مہاجن کے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اور جواب تک اپنی زمین کا بڑا حصہ قرض ادا کرنے کے لئے کھونے پر مجبور ہو چکا ہے۔ سب کچھ لٹ لٹا کر جس کسان کی صرف دو بیگھہ زمین باقی رہ گئی ہے اور یہ آخری دو بیگھہ زمین بھی زمیندار کی نظر میں کھٹکنے لگی ہے۔ ٹھاکر نے اس مشہور نظم میں یہ صاف دکھایا ہے کہ زمینداروں کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور غریب کسان کی زمین چھیننے کی ان کو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے چونکہ اس نظم میں زمیندار محض اپنے باغ کو چوکونا (چوگوشہ) بنانے کے شوق میں غریب کسان کی زمین چھین لیتا ہے۔ جب کسان اپنے باپ دادا کی آخری امانت دو بیگھہ زمین کو زمیندار کے ہاتھوں فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوتا

تب زمیندار اس غریب پر جھوٹا مقدمہ دائر کرکے بالکل مفت اس کی زمین کو ہڑپ کرلیتا ہے! آخرکار اپنی زمین چھوڑ کر، اپنا گاؤں چھوڑ کر وہ غریب کسان سادھو کے بھیس میں گاؤں سے نکل جانے پر مجبور ہو جاتا ہے ایسے موقعہ پر شاعر صاف صاف الفاظ میں زمینداروں، رئیسوں اور سرمایہ داروں کی لوٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"ہائے، رے دنیا
اس دنیا میں وہی اور زیادہ دولت کا طالب ہے
جس کے پاس پہلے ہی ڈھیر کا ڈھیر موجود ہے
راجا کا ہاتھ ہی وہ ہاتھ ہے
جو سب غریبوں کی پونجی ہڑپ کر لیتا ہے
چُرا لیتا ہے"

صرف نظم "دو بیگھہ زمین" ہی میں نہیں بلکہ کئی مضامین اور دیگر نظموں میں بھی زمیندار رابندر ناتھ نے اپنے عہد کے زمینداروں کے گھناؤنے کردار ان کی انگریز دوستی اور حاکموں کی خوشامد پر بار بار وار کئے، جس سے واضح ہے کہ وہ اپنے دور کے زمینداروں کے کردار سے نہایت ناخوش تھے اور ان کے ایسے کرتوتوں کو قومی بے عزتی سمجھا کرتے تھے بنگلہ سنہ ۱۳۰۵ مطابق ۹۸-۱۸۹۷ء میں انہوں نے زمینداروں کے کردار کے سلسلے میں لکھا :-

"ہمارے ملک کے زمیندار ...... ظلم ڈھا کر لگان وصول کرسکتے ہیں ...... ہمارے زمیندار اپنے آپ کو انگلستان کے لارڈ طبقہ کی طرح سمجھتے ہیں اور اس لارڈ (Lord) طبقہ کی نقل کرتے ہیں یہ لوگ کہتے ہیں "ہم ارسٹوکرائٹ (Aristocrat) اشراف ہیں ...... ہمارے ملک میں راجا، رائے بہادر" وغیرہ کو دیکھ کر لوگ دل سے احترام نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے خطابات پانے والے عوام کے دلوں میں، ایک رتی بھی بلند مقام

حاصل نہیں کر سکتے ______"

اسی مضمون میں خطاب یافتہ زمینداروں کی خوشامدانہ (انگریزوں کی) پالیسی پر گہرا طنز کرتے ہوئے رابندر ناتھ نے ایک مثال دیتے ہوئے لکھا ہے[1]

"سر الفرڈ کروفٹ، غالباً اچھے آدمی اور رئیس ہوں گے لیکن ایشور چندر ودیا ساگر ان سے بہت اچھے آدمی ہیں اور بہت بڑے انسان ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہمارے دیش کے ہیں لیکن کروفٹ صاحب ہندستان چھوڑ کر اپنے وطن چلے گئے ہیں۔ اسی رنج و غم سے ہمارے یہ رئیس زمینداران کی یادگار قائم کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں اور ودیا ساگر کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ دیش کے رئیسوں نے کوئی کوشش نہیں کی ان کی کوئی یادگار قائم کرنے کے لئے۔ کیا یہی زمیندار لوگ ہمارے دیش کے "نیچرل لیڈر" ہیں؟ ہمارے رہنما ہیں؟ یہ لوگ ہمیں کس طرف لے جا رہے ہیں؟"

نظم "دو بیگھہ زمین" کی تخلیق سے بہت پہلے ٹھاکر کا سماجی اور سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ اور وہ کسانوں اور مزدوروں کے حق میں آ چکے تھے۔ "اے بار پھرا دو مورے" (اب مجھے لوٹا دو" جس نظم کا ذکر پچھلے صفحات میں آ چکا ہے) جو بنگلہ سنہ ۱۳۰۰ مطابق ۹۴-۱۸۹۳ء کی تخلیق ہے کو رابندر ناتھ کی سیاسی بیداری کا اعلان نامہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس طویل نظم میں بنگال کے گاؤں گاؤں میں بسنے والے لوگ، کچلے ہوئے لوگ، تھکے ماندے بوجھ ڈھونے والے مزدوروں اور عام دیہاتیوں کی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے اور یہی نہیں کہ ان کی تصویر دکھائی گئی ہے بلکہ شاعر نے دیش کے رہنماؤں کو، ادیب اور شاعروں کو، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو، سماج سدھار کا کام کرنے والوں کو، للکارا اور ان سے صاف الفاظ میں کہا کہ عوام کی طرف دیکھو یہی ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ ہندستانی زبانوں کے ادب میں ۱۸۹۴ء سے پہلے ایسے واضح الفاظ میں کسی نے غربت، بھوک اور افلاس کے ماروں اور محنت کشوں کی عکاسی اور ترجمانی نہیں کی اور ان کی حالت کو سد...

---

[1] کلیات ٹھاکر، شائع کردہ، وشوا بھارتی جلد ۱۰، صفحات ۵۰۰

کے لئے، لوگوں کو متوجہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رابندر ناتھ کی یہ مشہور نظم ایک طویل عرصہ تک جنگ آزادی میں حصہ لینے والے بنگالی نوجوانوں کے دلوں کو گرماتی رہی ہے اور وہ اس نظم کو گاتے پھرتے رہے ہیں۔ ایک اور مشہور نظم "اکیا تان" میں رابندر ناتھ دنیا بھر کے کسانوں اور مزدوروں کی فتح مندی کے گن گاتے ہیں اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ وہ اس شاعر کی آواز سننے کے لئے بیتاب ہیں جو کسانوں اور مزدوروں کا ساتھی ہے، جو مٹی سے قریب ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

"میں اس شاعر کی آواز سننے کے لئے بیقرار ہوں
وہ، جو کسان کا ساتھی ہے
وہ، جو ان کی باتیں کرتا ہے
وہ، جو میدان عمل میں ان کا دوست ہے
وہ، جو مٹی سے قریب ہے
میں اس شاعر کی آواز سننے کے لئے بیقرار ہوں۔"

رابندر ناتھ کا بنیادی خیال یہ تھا کہ اس وقت تک ہندستان سے غربت، جہالت، بھید بھاؤ، چھوت چھات اور فرقہ پرستی دور نہیں ہو سکتی جب تک گاؤں سے کام کی ابتدا نہ کی جائے۔ یعنی جب تک دیہی عوام کے معیارِ زندگی کو بلند نہ کیا جائے، ان میں تعلیم کی روشنی نہ پھیلائی جائے۔ اپنی زمینداری کے سلسلے میں جیسے جیسے وہ دیہی زندگی سے قریب تر ہوگئے ان کا یہ خیال اور بھی پختہ ہوتا گیا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کے رہنماؤں میں، سیاسی جدوجہد کرنے والوں میں جب کسی نے دیہی ترقی کی طرف، دیہاتی سماج سدھار کی طرف نظر نہیں ڈالی تھی۔ تب وہ دیہاتی عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے خود عملی جدوجہد شروع کر چکے تھے۔ رابندر ناتھ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے خیال کو ملک کے لوگوں کے سامنے رکھتے، رہنماؤں سے کہتے اور اگر وہ کام کرنے کو تیار نہ ہوتے تب وہ خود کام کرنے لگ جاتے۔ سر کا خطاب حکومت کو واپس کر دینے کے سلسلے میں بھی ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی کام کے لئے آگے نہ بڑھے، تو تم کو اکیلا ہی کام کرنا چاہئے! اس خیال کا اظہار انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں یوں کیا ہے۔

"اگر کوئی تیری آواز پر لبیک نہ کہے

تری آواز سُن کر نہ آئے
تو ـــــــ تُو

اکیلا چل، اکیلا چل، اکیلا چل ـــــــ"

ٹھاکر کو اپنی زندگی میں کئی بار اس طرح "اکیلا چلنا" پڑا۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جب سب پیچھے ہٹ گئے تو وہ اکیلے ہی آگے بڑھے اور جو کچھ وہ خود کر سکتے تھے انہوں نے کسی کی پروا کئے بغیر کیا۔ دیہاتی زندگی کے سدھار کے سلسلے میں بھی وہ خود اپنے دو چار کارکنوں کو لے کر اپنی زمینداری کے علاقے میں کام کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی زمینداری کے تحت دو پرگنہ میں تعلیم کا انتظام، پینے کے پانی کا انتظام، کسانوں کے قرض کا انتظام، دیہی کوآپریٹو (امداد باہمی) کا قیام (یاد رہے کہ شانتی نکیتن میں بھی انہوں نے ایسا انتظام کیا تھا اور سنتھالوں کے لئے ایک کوآپریٹو اسٹورس کھولا تھا، پھر شری نکیتن میں جدید کاشت کا انتظام کیا تھا) جدید طریقے پر مشین سے کاشت کاری کا کام اور پھر پنچایت قائم کر کے پنچایتی عدالت کا قیام وغیرہ کی بنیاد ڈالی تھی (ایسے کئی کام جس پر آزادی کے بعد اب ہم غور و فکر کرنے لگے ہیں اور چند عملی قدم بھی اٹھا چکے ہیں۔) اور اسی طرح دیہاتیوں کی ترقی اور دیہاتیوں کو اپنی مدد آپ کرنے کا درس دینا شروع کیا تھا۔ اس کے برسوں بعد جب ۱۹۳۰ء میں انہوں سوویت روس کا سفر کیا تب انہوں نے وہاں کے کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ برسوں پہلے انہوں نے کسانوں اور مزدوروں کی ترقی کے سلسلے میں جو کچھ سوچا تھا اور عملی طور پر اقدامات کئے تھے، وہ کام اگر حکومت اپنے ہاتھوں میں لے کر انجام دے تو ملک کی ترقی نہایت تیز رفتار ہو گی۔ اس لئے انہوں نے روس کے سماجی انقلاب کی بھرپور تعریف کی اور کھل کر اس نظام حکومت کے گن گائے ہیں۔ ٹھاکر نے بار بار کسانوں کی ترقی کے لئے ایسی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً

(۱)

"کسان جو اناج پیدا کرتے ہیں اس کا ایک حصہ ان کے ہاتھوں "اناج بینک" کے طور پر جمع رکھنا ضروری ہے۔ دیگر کئی مسائل سے

یہ مسئلہ اہم ہے۔ یہ فاضل اناج وقت ضرورت کام آئے گا اور
اس سے دیہاتیوں کی صحت، تعلیم اور ان کے تہواروں وغیرہ کا سارا
انتظام بخوبی کیا جا سکے گا۔

(۲)

ہمارے گاؤں میں تعلیم، صحت اور آمدورفت کے لئے راستوں کی ترقی،
یہ سب کچھ ہم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم واقعی ایسا کرنا چاہیں۔ اگر ہم میں کام
کرنے کا جذبہ ہو اور اگر ہم میں اتحاد ہو۔"

اور ربندر ناتھ کسانوں کی ترقی کے سلسلے میں اس نتیجہ پر پہنچے :۔

دو کبھی میں دریائے پدما میں کشتی پر بیٹھے بیٹھے ادب کی تخلیق کرتا تھا،
سوچتا تھا، لکھ لکھ کر دیپ جلاؤں گا۔ کان کھو دوں گا۔ بس یہی میرا
کام ہے میں اور کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن جب کسی ایک کو بھی
راضی نہ کر سکا، سمجھا نہ سکا کہ ہمارے کام کی ابتدا دیہات سے ہو، کسانو ںکے
گاؤں گاؤں سے ہو اور وہ کام آج اور اب ہی سے شروع ہو تب کچھ دیر کے لئے
قلم کو کان پر رکھ کر مجھے کہنا پڑا۔ "میں خود اس کام میں لگ جاؤں۔"
کسان میں خود اعتمادی پیدا کرنا ہو گی۔ یہ میرا مصمم ارادہ تھا۔ اس
سلسلے میں دو باتیں ہمیشہ میرے دل میں ہلچل مچاتی رہیں۔ اول یہ کہ
زمین پر دراصل زمیندار کا حق نہیں ہے، کسان کا حق ہے اور دوم یہ کہ
امداد باہمی کے اصول پر کاشت ہو، ورنہ کسانوں کی ترقی ممکن نہیں
ہے ——"

—— (روس کے خطوط)

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی منڈیوں میں بحران آیا اور
دوسری طرف جوٹ مل (Jute Mill) مالکان اور ساتھ ہی دیسی تاجروں نے مل کر
کسانوں کو لوٹ کرنا شروع کیا، ٹھیک ان ہی دنوں (جب ربندر ناتھ روس کے سفر

میں تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء) اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ ابتدائی تعلیم کے لئے کسانوں پر تعلیمی ٹیکس لگانے کا قانون منظور ہو گیا ہے اس خبر سے ٹھاکر غم و غصہ سے پھٹ پڑے اور انہوں نے "روس کے خطوط" میں لکھا:-

"اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ حال ہی میں میرے وطن میں ابتدائی تعلیم کو پھیلانے کے لئے یہ قانون منظور ہوا ہے کہ رعایا کا کان مل کر تعلیمی ٹیکس وصول کرو، اور یہ ٹیکس وصول کرنے کی ذمہ داری زمینداروں کو دی گئی ہے یعنی رعایا جو پہلے سے ہی نیم جان ہیں، تعلیم کے بہانے ان کو مزید بار رو .... یقیناً تعلیمی ٹیکس ہونا چاہیے، ورنہ خرچ کیسے پورا ہوگا لیکن ملک کی بھلائی کے لئے، جو ٹیکس ہے وہ سب مل کر کیوں نہیں دیں گے؟ سیول سروس کے لوگ ہیں، ملٹری سروس کے لوگ ہیں، گورنر، وائسرائے اور ان کی مجلسوں کے ممبران ہیں۔ کیوں ان کی بھرپور جیبوں میں ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا۔ کیا وہ لوگ کسانوں کی محنت سے اپنی اپنی تنخواہ اور پنشن لے کر آخر کار اپنے ملک میں جا کر مزے نہیں کرتے ہیں؟ جوٹ کل کے جو بڑے بڑے ولایتی مہاجن ہیں، جو پٹ سن کاشت کاروں کے خون سے بھاری بھرکم منافع کما کر وطن (ولایت) کو بھیج رہے ہیں، ان پر کیوں ان نیم مردہ کسانوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی ___ ؟"

اصل ہندستان اپنے گاؤں میں آباد ہے اس حقیقت کو ربندرناتھ سے پہلے ہمارے ملک کا کوئی رہنما سمجھ نہیں پایا تھا۔ ٹھاکر نے ان خیالات کا اظہار صاف الفاظ میں ۱۹۰۶ء ہی میں کیا تھا کہ جب تک کسانوں کو عوامی تحریک میں شامل نہ کیا جائے گا اس وقت تک ہندستان آزاد نہیں ہو سکتا! اور نہ ہی ہندستان کی معاشی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ سودیشی تحریک کے دنوں جب چند سیاسی رہنماؤں کو کسانوں کا خیال آ ہی گیا اور وہ کسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور سودیشی تحریک میں ان کو شامل کرنے کے لئے دیہاتوں میں جانے لگے، تب ربندرناتھ نے کہا کہ اس طرح کام نہیں ہوگا۔ اونچے پلیٹ فارم سے آواز دینے پر کسان ساتھ نہیں دیں گے۔ کسانوں

لو ساکھی بنانے کے لیے، اونچے پلاٹ فارم سے نیچے اترنا ہوگا کسانوں میں مل جانا پڑے گا تاکہ کسان محسوس کریں کہ یہ شہر کے بابو لوگ ان کے اپنے ہی لوگ ہیں گاندھی کرنے ایسے بابو لیڈروں پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا:-

"آج شہر کے انگریزی پڑھے ہوئے کچھ لوگ، جب ان پڑھ دیہاتی لوگوں کے پاس جا کر ان سے کہتے ہیں کہ "ہم سب بھائی بھائی ہیں" تب وہ سیدھے سادھے لوگ لفظ "بھائی" کا مفہوم سمجھ نہیں پاتے۔ جن لوگوں کو ہم "جاہل کسان" کہہ کر جانتے ہیں جن کے سکھ دکھ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، ہم نے کبھی جن کی پروا نہیں کی، جن کی حالت کو جاننے کے لئے ہم حکومت کے شائع شدہ اعداد وشمار پڑھتے رہے —— آج اچانک انگریزوں کے خلاف کمر باندھنے کے سلسلے میں ان کو "بھائی" کہہ کر ان سے رشتہ جوڑیں تو فطرتاً ان کو ہم پر شک و شبہ ہوگا۔ اور شک ہوا بھی ہے ایک نامور سودیشی رہنما کی زبانی سنا کہ جب وہ مشرقی بنگال کے مسلمان کسانوں میں تقریر کر رہے تھے تو ان کی تقریر سن کر وہ کسان آپس میں کہنے لگے "—— بابو لوگوں پر شاید کوئی آفت آئی ہے"! کسان نے ٹھیک ہی سمجھا۔ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے، اگر دوستی کا رشتہ کرنے جائیں تب شک تو ہوگا ہی چاہے مقصد کتنا ہی عظیم ہو۔ چاہے اس کا نام "بائیکاٹ"، سوراج، یا ملک کی ترقی یا کچھ اور ہی کیوں نہ ہو......

کسی گاؤں میں بیٹھ کر، جسے کسی نے کبھی بلا کر بات تک نہیں کی۔ اسے علم دو، آگاہ کرو، خوشی دو، امید دلاؤ، اس کی خدمت کرو، سیوا کرو، اسے محسوس ہونے دو کہ وہ بھی انسان ہے اس کی بھی اہمیت ہے اس دنیا میں وہ بے کار محض نہیں ہے لاعلمی نے اسے اپنے سائے سے بھی خوفزدہ کر رکھا ہے ہر خوف سے اسے نجات دلا کر، اس کے دل میں ہمت لے آؤ۔ اسے ناانصافی سے، ظلم سے، زیادتی سے، اندھیرے سے بچاؤ، جن کی بھلائی

کے لئے تم نے کمر باندھی ہے، ہر روز ان کے قریب سے قریب تر ہوتے رہو، ایک
ایک قدم کر کے کامیابی کی طرف آگے بڑھو۔ میری یہی آرزو ہے کہ ملک کے ایک
ایک کونے میں، ایک ایک ایسا خادم بیٹھ کر اپنی تمام عمر دے کر، کسی
ایک کام کو پورا کرنے لگ جائے۔"[1]

رابندر ناتھ سیاست داں نہیں تھے کسی کسان سبھا سے ان کا تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ مزدور رہنما یا ٹریڈ یونین لیڈر تھے۔ رابندر ناتھ نے نہ کبھی اپنے آپ کو سیاسی رہنما قرار دیا اور نہ کسانوں اور مزدوروں کا رہنما۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو شاعر ہی کہا ہے لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ یہ شاعر محنت کش عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے کتنا قریب تھا۔

اگر کسی شاعر کو "غمِ جاناں" کے علاوہ "غمِ دوراں" کی فکر بھی ہو اور اسے غمِ دوراں کے سلسلے میں کچھ کہنا ہو، تو سب سے پہلے اسے "غمِ دوراں" کا حقیقی علم ہونا ہوگا اور "غمِ دوراں" کا درست علم وہی حاصل کر سکتا ہے جو سماجی ارتقار کا شعور رکھتا ہو۔ جب سماج کے سلسلے میں کہنا ہو، اور سماج کی اکثریت کو حالات کا ذکر نہ کیا جائے تو پھر سماج کا معنی؟ تاریخی شعور کا تقاضا ہے کہ سماج کی تصویر اتارنے کے لئے اور پھر سماج کو آگے بڑھانے کے لئے، کسانوں اور مزدوروں کے صحیح حالات، ان کو روزمرہ مسائل اور مستقبل کی تعمیر کے راستے کو ہموار کرنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیا جائے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ رابندر ناتھ محنت کشوں کے نمایندے تھے۔ لیکن غالباً ٹھاکر محنت کشوں کے جتنے قریب آئے تھے اس سے زیادہ اس سماجی پس منظر میں کسی شاعر کے لئے مزدوروں کی طرفداری کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور ہندستان کی ادبی تاریخ میں اس وقت کا کوئی فنکار ایسا نظر نہیں آتا جس نے رابندر ناتھ کی طرح کھل کر محنت کشوں کا ساتھ دیا ہو۔ محنت کشوں سے متعلق رابندر ناتھ کے شعور کا سفر انیسویں صدی کے آخری دہائی سے شروع ہوا، اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک وہ وقت ضرورت مزدوروں کے حق میں آئے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہماری جنگ آزادی ابتدائی مرحلے میں تھی۔ قومیت اور آزادی وغیرہ کی باتیں اونچے متوسط طبقہ اور دانشوروں کے گھروں کی چہار دیواری تک محدود تھیں۔ مزدوروں کی تحریک بھی ابھری

---

[1] کلیات ٹھاکر، وشوا بھارتی ایڈیشن، جلد ۱، صفحات ۳۲۰ اور ۱۲۷۔

نہیں تھی اور جنگ آزادی میں مزدور شامل نہیں ہوئے تھے۔ تعلیم کی روشنی چند گھروں تک محدود تھی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں دو چار ٹریڈ یونین برائے نام قائم ہوئی تھیں پھر رفتہ رفتہ تحریک آزادی جتنی بڑھتی گئی اس میں اونچے طبقہ کے بدلے درمیانی طبقہ کے لوگ شامل ہوتے گئے۔ محنت کشوں کی لڑائی کا رشتہ تب تک جنگ آزادی سے منسلک نہیں ہوا تھا۔ دانشور جو آزادی کی باتیں کرتے تھے وہ بھی مزدوروں سے اپنے تعلقات قائم نہیں کر پائے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ آزادی کے پہلے دور میں رابندر ناتھ محنت کشوں کے سلسلے میں سوچنے لگے تھے اور ان کی تخلیقات میں مزدوروں کی باتیں آنے لگی تھیں لہذا صاف ظاہر ہے کہ ٹھاکر نے تاریخ کے نئے دھارے کو سمجھ لیا تھا اور غالباً وہ پہلے فنکار ہیں جن کی تخلیقات میں مزدوروں کا ذکر تا کھل کر آیا ہے۔ رابندر ناتھ کے ادب میں محنت کشوں کے جو کردار ہیں وہ ایسے ہیں جو اس عہد کے کسی اور فنکار کی تخلیقات میں ناپید ہیں۔ شری نیپال مجومدار نے رابندر ناتھ پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:[1]

"بنگال میں پٹ سن (JUTE) ایک ایسی پیداوار ہے جس کا نہایت گہرا تعلق پورے بنگال کی معاشیات سے ہے بلکہ پٹ سن کی پیداوار کو بنگال کی پیداوار میں ریڑھ کی ہڈی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ پاٹ کی کاشت سے جہاں لاکھوں لاکھ کسانوں کی زندگی کا تعلق ہے وہیں پاٹ کی صنعت یعنی جوٹ کل بنگال کی وہ بنیادی صنعت ہے جس سے لاکھوں مزدوروں کی زندگی وابستہ ہے اگر یہ آزادی سے پہلے حقیقت رہی ہے تو آزادی کے برسوں بعد آج بھی بنگال کی معاشیات میں اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ رابندر ناتھ گاتے رہے "میں آزاد ہوں۔" اور شاعر عوامی زندگی سے کتنے قریب تھے اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پٹ سن کی کاشت کرنے والے کسانوں اور پھر جوٹ کل میں کام کرنے والے مزدوروں کی تحریک سے نہ صرف ہمدردی رکھتے تھے بلکہ انہوں نے کھل کر انگریز سامراجیوں کی مزدور دشمن پالیسی، انگریز مالکانِ جوٹ کل اور اس صنعت سے تعلق رکھنے والے ہندستانی سرمایہ داروں کی مزدور دشمن پالیسی کی ہمیشہ مخالفت کی ہے خاص کر پہلی جنگ عظیم کے دنوں، جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جوٹ کل مالکان اور تاجران (انگریز اور ہندستانی) نے مل کر جوٹ کل مزدوروں اور پٹ سن کے کاشت کاروں کو نہایت بری طرح لوٹا

---

[1] سہ ماہی بنگلہ رسالہ "ایکتان" رابندر ناتھ نمبر ۸۶-۱۹۸۶ء۔ کلکتہ۔

ان منافع خوروں کے خلاف رابندر ناتھ کی نفرت بھری تحریریں آج بھی ہماری آنکھیں کھول رہی ہیں انہوں نے انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو (جنوری ۱۹۳۰ء) میں لکھا:۔ لہ

یہ جانی ہوئی بات ہے کہ زمانہ جنگ میں بنگال کے بعض جٹ کلوں میں چارسو فیصد منافع ہوا جس منافع کی خاطر بے شمار لوگوں کو نہایت ہی غیر فطری اور پراگندہ ماحول میں زندگی گزارنی پڑی ہے ایسا ماحول جو نہ صرف جسمانی صحت کے لئے خطرناک ہے بلکہ جہاں انسانی اخلاقی قدروں کا محفوظ رہنا بھی دشوار ہے یہ توہین انسانیت ہے —— اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عیار منافع خور مالکان اور تاجران، غریب اور رفاقہ کش کسانوں کے واجب الادا حصّے کو کس دھوکے بازی سے ہضم کر جاتے ہیں۔ کسانوں کو بازار بھاؤ کا علم تک ہونے نہیں دیا جاتا۔ اور اس طرح ان کو اندھیرے میں رکھ کر لوٹا جاتا ہے خاص کر جنگ کے دوران جب گرمی تیز تھی تب یہ کاشت کار مجبور کئے گئے کہ وہ اپنی فصل کو لاگت سے بھی کم قیمت پر فروخت کردیں اور اب جب کہ حالات اچھے ہیں اس وقت بھی غذا پیدا کرنے والوں کو قحط کے منہ میں دھکیلا جارہا ہے وہ طاقت جو مزدوروں کا خون چوستی ہے اور ہڈیوں تک کو چبا ڈالتی ہے اس طاقت کی پشت پناہی ایک اور طاقت کررہی ہے جسے انتظامیہ کہا جاتا ہے۔"

اس سے قبل رابندر ناتھ نے ۱۲۲۵ء میں "پچھم جاتریر ڈائری" (پچھم کے مسافر کی ڈائری) میں انگریز سامراج کس طرح ہندستان کو لوٹ رہے ہیں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا۔

"انگریز رئیس بنگال کے پٹ سن بازار کا خون چوس کر چار یا پانچ سو فیصد منافع کما کر اپنے وطن کو لے جاتے ہیں لیکن اس ملک کی بھلائی کے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتے! اس ملک میں قحط، سیلاب اور وبا سے جو لاکھوں لوگ مرتے ہیں اس سے وہ رتی بھر متاثر نہیں ہوتے

لہ سہ ماہی بنگلہ رسالہ "ایکہ تان"۔ رابندر ناتھ نمبر ۱۹۸۶ء کلکتہ

اور جب بنگال کے ان پڑھ، بیمار، قحط زدہ بھوکوں کے سینوں پر پولیس ظلم
ڈھا کر، خونی حکمراں سخت قوانین لاگو کرتے ہیں، تب وہ عیش پرست رئیس
منافع کی آرام کرسی پر آرام فرماتے ہوئے کہتے ہیں ——— "یہی درست
طریقہ ہے، ہندستان پر حکومت کرنے کا۔"

ہمارے وہ دانشور جو رابندر ناتھ کو محض شاعرِ حسن و عشق، شاعرِ فطرت، شاعرِ روحانیت وغیرہ کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں انہوں نے ٹھاکر کو یا تو سمجھا ہی نہیں یا اگر سمجھا ہے تو وہ مفاد پرستوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں، جن کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ ٹھاکر کی اصلیت کو عوام سے پوشیدہ رکھیں۔ یہ درست ہے کہ رابندر ناتھ سیاسی معنوں میں اشتراکی یا کمیونسٹ نہیں تھے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس عہد کے کسی سیاسی رہنما، اشتراکی یا کمیونسٹ رہنما نے بھی ہندستان کی معاشی حالت یہاں کے کسانوں اور مزدوروں کی روزمرہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کو اتنا صاف اور واضح طور پر پیش نہیں کیا جتنا کہ ٹھاکر نے کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہے کہ انہوں نے ہندستان کی معاشی حالت کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، تب ہی تو وہ یہ محسوس کر پائے کہ انقلاب آنے کو ہے اور اس انقلاب کے قدم رک نہیں سکتے۔ رابندر ناتھ کی تخلیقات میں تین ڈرامے (اچلائن ۱۹۱۱ء "رکت کربی" ۱۹۲۶ء اور "رتھیر رسی" ۱۹۳۲ء) کا تعلق محنت کش انسانوں سے ہے۔ "اچلائن" میں انہوں نے ہندو دھرم کی سخت پابندیوں کو توڑا تو "رکت کربی" میں سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور جس طرح لوٹے جاتے ہیں کو اجاگر کیا اور رتھیر رسی میں شاعر نے بتایا کہ اس دنیا کو چلانے والے دراصل مزدور ہیں۔ لہٰذا مستقبل کا دار و مدار ان پر ہے۔ "اچلائن" میں مزدوروں کو رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑ کر وہ آگے بڑھاتے ہیں، حالانکہ اس ڈرامے میں مزدور سماج کے رہنما نہیں ہیں بلکہ متوسط طبقے (دادا ٹھاکر) کا فرد ان کا رہنما ہے لیکن "رکت کربی" کے آخر میں انقلاب کی رہنمائی محنت کش انسان کرتے ہیں اور "رتھیر رسی" میں محنت کش انسان ہی انقلاب کے رہنما ہیں اور وہی سماج کو آگے کھینچ کر لے جاتے ہیں۔

شانتی نکیتن کے ایک جلسہ (۶ر فروری ۱۹۳۶ء) میں انہوں نے دنیا کی معاشی حالت

کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہا ـــــ

"موجودہ تہذیب میں دیکھتا ہوں کہ ایک مقام پر لوگوں کا ایک گروہ (طبقہ) غذا کی پیداوار کے لئے اپنی تمام تر قوت صرف کر رہا ہے، اور دوسری طرف ایک اور مقام پر ایک اور گروہ (طبقہ) کے لوگ آرام سے رہ کر اس غذا پر زندہ ہیں ـــ ۔ آج دنیا کا معاشی مسئلہ اتنا پیچیدہ ہوگیا ہے کہ بڑے بڑے عالم بھی اس کی حقیقی وجہ تلاش نہیں کر پا رہے ہیں۔ روپیہ ہے کہ جمع ہوتا جا رہا ہے، ڈھیر ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ اس کی قوت خرید، اس کی قیمت گھٹ رہی ہے ـــــ دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم میں جو فرق تھا، بھید تھا، وہ آج بہت بڑھ گیا ہے۔ ـــــ اس کی ایک زندہ مثال اپنے گھر میں (وطن) دیکھ پاتا ہوں۔ بنگال کے کسان اپنا خون پسینہ ایک کر کے پٹ سن پیدا کر کے مر رہے ہیں، جب کہ وہی پٹ سن کی پیداوار کا سرمایہ بنگال کی حالت سدھارنے میں خرچ نہیں ہو رہا ہے یہ جو ظلم سے لین دین کی فطری راہ میں رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے، یہ رکاوٹ، یہ زبردستی ہی ایک دن اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ ایسی حالت میں مختلف صورتوں میں دنیا بھر میں (بیماری) مشکلات پیدا کر رہی ہے اور تباہی لا رہی ہے۔ سماج میں جو اپنی زندگی کو قربان کر رہے ہیں وہ بدلے میں کچھ نہیں پا رہے ہیں۔ یہ نا انصافی ہمیشہ چل نہیں سکتی۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ لین دین میں یہ غیر مساوات ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی۔ دولت کی تقسیم میں یہ غیر مساوات یقیناً انقلاب لائے گی۔"[۱]

شری نیپال مجومدار نے ۱۹۲۹ء میں چٹ کل صنعت اور مزدوروں کی حالت پر روشنی

---

[۱] بنگلہ ماہنامہ "پرباسی" ماہ چیت ۱۳۴۰ مطابق ۱۹۳۴ء صفحہ ۷۳۹

ڈالتے ہوئے لکھا ہے[1]

"۱۹۲۹ء میں جوٹ مل مزدوروں کی تعداد ۳ لاکھ ۳۹ ہزار ۶۶۵ تھی۔ چھٹائی کرتے کرتے ۱۹۳۴ء میں مزدوروں کی تعداد گھٹ کر ۲ لاکھ ۳۶ ہزار ہوگئی یعنی ۱۹۲۹ء کے بعد فی صد ۲۷ مزدور نوکری سے نکال دیئے گئے۔

ایک طرف بے روزگاری میں بے انتہا اضافہ ہوا تو دوسری طرف مزدوری میں بھی کمی کی گئی اور ساتھ ہی کام کرنے کا وقت بھی بڑھا دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء سے بین الاقوامی بحران میں کچھ سدھار ہونے پر کارخانوں کے مالکان نے زور و شور سے کام شروع کیا لیکن مزدوری بڑھانے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں جوٹ مل مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔ بنگال میں "حق۔ناظم الدین" وزارت قائم ہونے سے پہلے (۱۹۳۷ء سے پہلے) ہی یہ ہڑتال شروع ہوئی تھی لیکن "حق۔ناظم الدین" وزارت قائم ہونے کے بعد اسی وزارت نے مزدوروں کی ہڑتال توڑنے کی ہر طرح کوشش کی۔ حتیٰ کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو بھی پھیلایا گیا۔ پھر نئی وزارت نے بے پروا لاٹھی گولی اور دفعہ ۱۴۴ کا سہارا لے کر مزدور رہنماؤں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا ——

شاعر رابندرناتھ ان دنوں الموڑا جا رہے تھے۔ انہوں نے اخبارات میں مزدوروں کی ہڑتال کے سلسلے میں پڑھا تھا۔ شاعر انگریز جوٹ مل مالکان کی خصلت سے بخوبی آگاہ تھے اور غالباً چند مزدور رہنماؤں نے بھی شاعر سے ملاقات کی تھی۔ الموڑا روانہ ہونے سے پہلے شاعر نے —— جوٹ مل مزدوروں کے حق میں ایک اخباری بیان دیا اور نئی وزارت سے درخواست کی کہ وہ مزدوروں سے انصاف کرے اور ان کے مطالبات تسلیم کرلے جائیں۔ ساتھ ہی عوام سے اپیل کی کہ وہ مزدوروں کا ساتھ دیں۔ ۲۹ اپریل ۱۹۳۷ء کو شاعر نے جو اخباری بیان دیا تھا وہ حسب

---

[1] بنگلہ ساہتیہ "ایکشن" رابندرناتھ نمبر ۱۹۸۶ء صفحہ ۴۹-۵۰۔

ذیل ہے۔

"یہ جان کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ گزشتہ فروری سے ہزاروں ہزار
چٹ کل مزدور ہڑتال کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور وہ نہایت ہی مشکلات
میں دن کاٹ رہے ہیں۔ ہڑتال کی وجہ سے نہ صرف مزدور بلکہ ان کی بیوی
بچوں کو بھی فاقہ کرنے کی نوبت آگئی ہے۔ مزدوری میں اضافہ اور ساتھ
ہی کام کرنے میں انسانی حقوق کے مطالبات جو کہ وہ مزدور کر رہے ہیں،
وہ مطالبات بالکل حق بجانب ہیں ـــــ کیا ہم یہ امید نہیں رکھیں کہ ہماری
نئی وزارت اس مسئلہ کو جس سے لاکھوں زندگیوں کا تعلق ہے اپنے
ہاتھوں میں لے گی اور انصاف کرے گی۔ انسانیت کا تقاضہ ہے کہ وہ
لوگ جو سماج کی خاطر محنت کرتے ہیں اور سماج کا بوجھ ڈھوتے ہیں۔
سماج بھی ان کی طرف دیکھے۔ اس ہڑتال کو جو فرقہ وارانہ رنگ دینے
کی کوشش کی جارہی ہے ہر باشعور انسان کو اس کی مخالفت کرنی
چاہیئے۔ میں اپنے ہم وطن لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ایسے نازک وقت
پر وہ چٹ کل مزدوروں کے حق بجانب مطالبات کا ساتھ دیں۔ اور
اس مصیبت میں ان کی بیوی بچوں کو تکالیف سے بچائیں۔"

کیا اس سے صاف اور کوئی بیان دیا جا سکتا تھا؟ کیا اس سے ربندر ناتھ کے خیالات
واضح نہیں ہیں۔؟ بہرحال اس کے بعد وزارت حرکت میں آئی تھی اور چٹ کل مزدوروں اور مالکان
میں گفتگو ہوئی۔ اور ۱۰ مئی کو یہ تاریخی ہڑتال واپس لے لی گئی تھی ـــــ شاعر کا مجموعۂ کلام
"چھڑار چھبی" کی چند نظموں میں ہم مزدوروں کی زندگی کا ذکر پاتے ہیں جو اس دور کی یادگار ہے۔ ربندر ناتھ
نے زندگی بھر محنت کشوں کا ساتھ دیا ہے۔ آخری عمر کی نظموں میں وہ کھل کر محنت کشوں کے حق
میں آگئے تھے۔ ۱۳ر فروری ۱۹۴۱ء کو انہوں نے مشہور نظم "اورا کاج کرے" (وہ کام کرتے ہیں)
کہی جس میں شاعر نے صاف کہا کہ جس طرح خون کی ندیاں بہانے والے فاتح عالم سب کے
سب مٹ گئے۔ اور پھر تاریخ کے صفحات میں ان خون کے دریاؤں کی باتیں دفن ہیں اسی طرح

انگریز سامراجیوں کی حکومت بھی مٹ جائے گی۔ باقی رہیں گے کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کرنے والے، فصل اگانے والے، محنت کرنے والے، وہ لوگ جو جگ جگ سے محنت کرتے آئے ہیں، محنت کو رہے ہیں، ملک ملک میں، دیس دیس میں، کیوں کہ محنت امر ہے۔
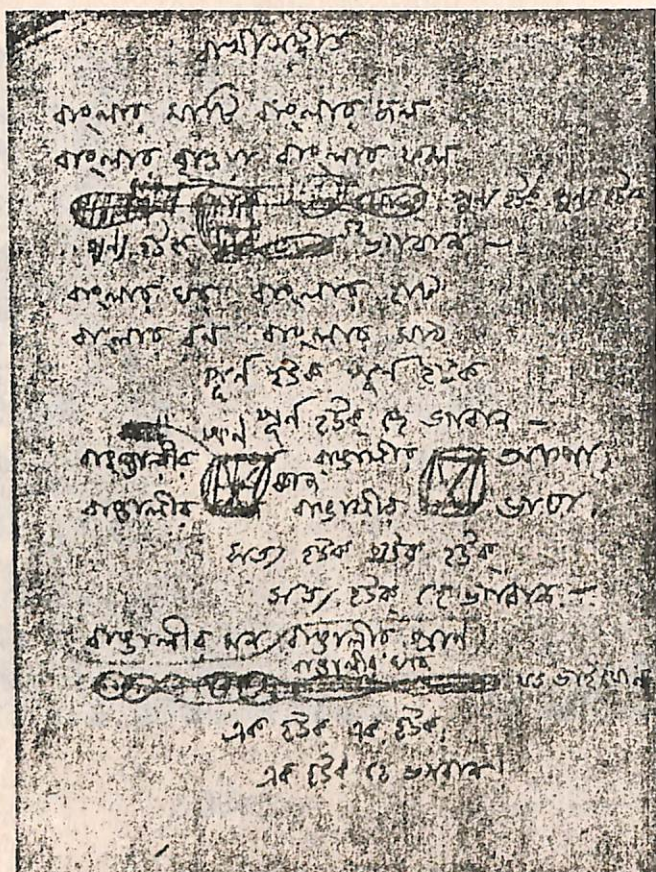
—Fascimile of the great 'Rakhi-song' composed by the Poet initiating the 'Rakhi-bandhan' ceremony to symbolise the unity of Bengal on October 16, 1905,—the day the "partition" of the province was given effect to by Lord Curzon
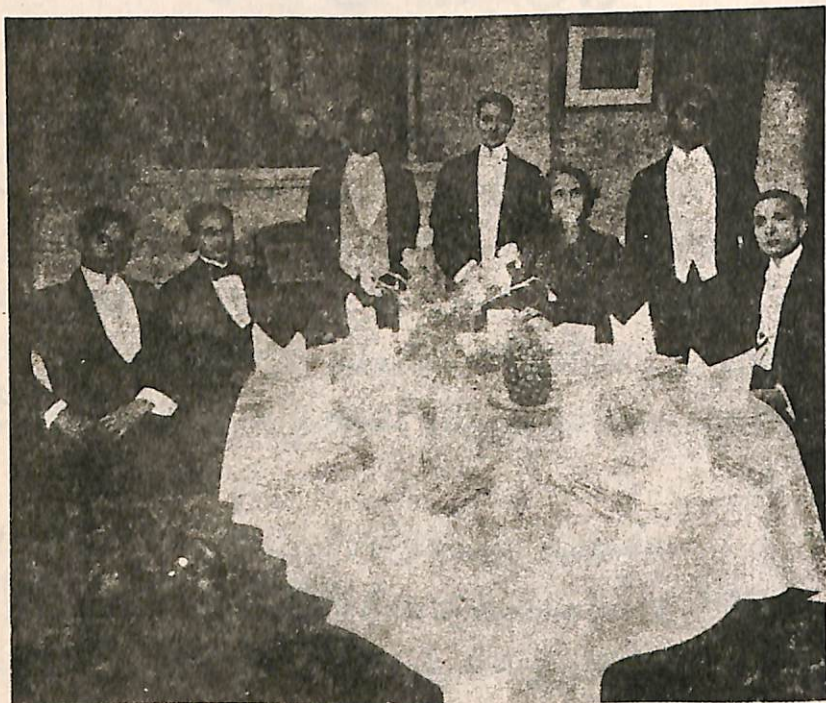
ٹیگور آکسفورڈ میں ـــــــ ۲۳ مئی ۱۹۱۳ء
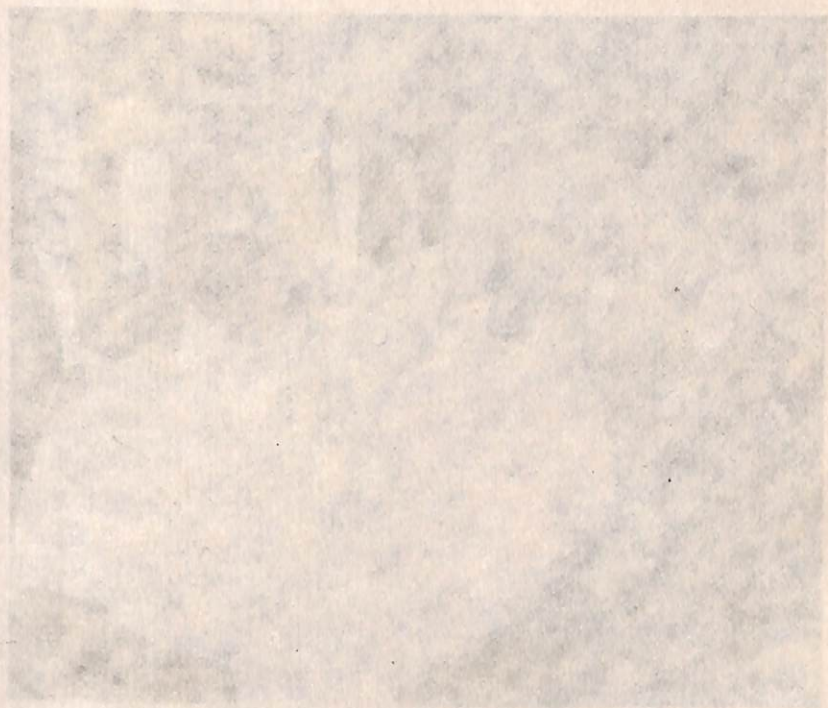
زبان اور تعلیم کے مسائل

جدید ہندستانی زبانوں میں (جن میں سے ایک اردو بھی ہے) بنگلہ زبان وہ خوش نصیب زبان ہے جس کو ایک فرد واحد (رابندر ناتھ) ایسا ملا جس نے اسے ہر لحاظ سے مالا مال کیا۔ اور دنیا کی ترقی یافتہ ادبی زبانوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ رابندر ناتھ کو بنگلہ زبان کا پہلا ماہر لسانیات بھی کہا جا سکتا ہے جس نے لسانی نقطۂ نظر سے اس زبان پر نظریں ڈالیں اور اس کی ترقی کے راستے میں جو بے شمار دشواریاں تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی اور کئی کامیاب قدم بھی اٹھائے بنگلہ رسم خط، املا اور قواعد کی کئی کمزوریوں کو انہوں نے دور کیا اور کئی جدید اصطلاحات بھی واضع کئے۔

اردو کے صاحب طرز ادیب و شاعر انشاء اللہ خاں انشاؔ، وہ اوّلین فرد ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف "دریائے لطافت" میں اردو کے سائنٹفک اصول بتاتے ہوئے واضح کیا کہ اردو نہ فارسی ہے اور نہ عربی بلکہ اردو ایک الگ زبان ہے اور لسانی اصولوں کے مطابق اس نے دیگر زبانوں سے الفاظ قبول کئے۔ لہٰذا اردو نے الفاظ کو جس طرح اپنایا ہے وہی اردو کے لئے درست ہے چاہے فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے لحاظ سے ان الفاظ کا اس طرح استعمال (جیسا کہ اردو میں کیا جاتا ہے) غلط ہی کیوں نہ ہو۔ بنگلہ زبان کے سلسلے میں رابندر ناتھ کا بھی یہی خیال رہا ہے انہوں نے محسوس کیا کہ بنگلہ زبان میں الفاظ کی کمی ہے اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے اسے نہ صرف نئے الفاظ ڈھالنا ہوں گے بلکہ دیگر زبانوں سے قبول بھی کرنا ہوں گے۔ جس طرح وہ اب تک قبول کرتی آئی ہے یہ درست ہے کہ ہندستانی زبانوں نے سنسکرت (اور اس کی بگڑی ہوئی شکلیں، اپ بھرنش اور پراکرت وغیرہ) سے بہت کچھ لیا ہے اور بنگلہ نے بھی لیا ہے لیکن ہر زبان کا اپنا

اصول ہے اور وہ اپنی لسانی اصولوں کے مطابق ہی الفاظ کو اپناتی ہے۔ زبان کا مزاج نہایت نازک ہوتا ہے اس میں کوئی چیز زبردستی داخل نہیں کی جا سکتی۔ زبان اسے ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ اگر کسی زبان میں اوپر سے الفاظ لادے بھی جائیں تو وہ الفاظ دیرپا نہیں رہتے۔ زبان دانی کے سلسلے میں ربندرناتھ کی پہلی تصنیف "شبد تتو" (اصول الفاظ) ۱۹۰۹ء میں اور دوسری "بنگلہ بھاشا پریچے" (تعارف بنگلہ زبان) ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ ان تصانیف میں انہوں نے لکھا کہ سنسکرت زبان جہاں تک بنگلہ کے مزاج کا ساتھ دیتی ہے اس حد تک اس کے الفاظ قابل قبول ہیں لیکن جو ہماری زبان پر بوجھ ہیں ان کو ترک کرنا پڑے گا۔ کوئی ہزار سال ہوئے سنسکرت سے فطری اصولوں کے مطابق پراکرت اور اپ بھرنش سے ہوتے ہوئے بنگلہ زبان پیدا ہوئی اور اس نے دیگر اثرات بھی قبول کئے اور اس طرح جدید بنگلہ زبان بنی ہے جس زبان نے سنسکرت کے الفاظ سے آغاز سفر کیا تھا اس میں "تت سم" اور "تت بھو" اور پھر ملک ملک کے مختلف زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ہی دیگر دیسی زبانوں کے الفاظ آتے گئے اور زبان آگے بڑھی۔ یہی کسی زبان کی ترقی کا فطری اصول ہے۔ اب جو زبان سنسکرت سے پرے ہٹ کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی ہے اور کافی آگے بڑھ چکی ہے اور جس کے اپنے اصول بن چکے ہیں اس زبان کو سنسکرت کے سہارے صحت مند کرنا بے معنی ہی نہیں بلکہ غیر فطری ہے۔ ایسی کوشش کرنے کو ربندرناتھ نے "Original Sin" قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1]

"درحقیقت ہر زبان کا ایک سانچہ ہے، خام مال وہ کہیں سے بھی قبول کرے لیکن اس خام مال کو اپنے سانچے میں ڈھال کر اسے اپنا لیتی ہے۔ یہ سانچہ ہی اس کا اپنا ہے اور یہی اس کی پہچان ہے۔"

فارسی اور اردو وغیرہ سے الفاظ قبول کرنے کے سلسلے میں بھی ربندرناتھ کا ذہن صاف تھا۔ انہوں نے ایسے بنگالی ادیبوں کی سخت مخالفت کی ہے جو بنگلہ زبان میں فطری اصول کے خلاف عربی، فارسی اور اردو الفاظ کو ٹھونستے ہیں۔ ایسے ادیبوں کے سلسلے میں انہوں نے لکھا[2]

---

[1] اور [2] بنگلہ چھ ماہی رسالہ "سپتا پرنی" مئی ۱۹۸۶ء مضمون "لسانیات اور ٹھاکر"۔ [3] بنگلہ ماہنامہ "پرباسی" بنگلہ سمت بیساکھ ۱۳۴۱ مطابق ۱۹۳۴ء ص ۱۰۳۔

"آج کی بنگلہ زبان اگر بنگالی مسلمانوں کے خیالات و احساسات
کو ادا کرنے کے لائق نہ ہو، تب وہ لوگ بنگلہ زبان کو چھوڑ کر اردو کو
قبول کر سکتے ہیں۔ ایسا قدم اٹھانا بنگالیوں کے لئے کتنا ہی
افسوسناک کیوں نہ ہو لیکن اگر بنگلہ زبان کی فطری ترقی اور
اس کے قدرتی حسن کو اس طرح الفاظ ٹھونس کر بگاڑا جائے تو
وہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہوگا۔"

لیکن فطری اصولوں کے مطابق جو ہزاروں عربی، فارسی اور اردو وغیرہ کے الفاظ
بنگلہ زبان میں رواج پا گئے ہیں اور ان کی ربندرناتھ نے کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ ان الفاظ کو
بنگلہ زبان کے لئے ضروری قرار دیا۔ اسی مضمون میں آگے چل کر انہوں نے لکھا۔

"بنگلہ زبان میں فطری طور پر ہزارہا فارسی اور عربی الفاظ داخل
ہوئے ہیں اس میں غیر فطری کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی زبردستی
ان کو بنگلہ زبان میں داخل کیا گیا ہے لیکن جو فارسی، عربی الفاظ
بنگلہ زبان میں رائج نہیں ہیں (یا صرف چند مخصوص گھروں میں ان
کا استعمال ہے) ایسے الفاظ کا بنگلہ زبان میں استعمال درست
نہیں مثلاً "قتل" کے معنی میں لفظ "خون" کا استعمال بنگلہ میں ہے عام
بنگلہ زبان میں یہ استعمال رواج پا گیا ہے لیکن اگر BLOOD کے معنی
میں لفظ "خون" کا بنگلہ میں استعمال کیا جائے تو یہ غلط اور غیر فطری
استعمال ہوگا کیوں کہ BLOOD کے معنی میں بنگلہ زبان میں لفظ
"خون" کا استعمال کہیں پایا نہیں جاتا اور نہ ہی لوگ اس طرح
بولا کرتے ہیں ——— اردو زبان میں عربی، فارسی الفاظ کے
ساتھ ہندی اور سنسکرت الفاظ کو ملایا جا رہا ہے لیکن اس کی بھی
ایک حد مقرر ہونا ضروری ہے چوں کہ کوئی بھی ادیب کیوں نہ ہو وہ
جب اردو میں لکھتا ہے تب وہ "اردو" ہی میں لکھتا ہے۔ عربی،

"فارسی یا ہندی میں نہیں۔ اگر وہ ادیب اپنی اردو زبان میں غیر ضروری
طور پر دیگر کسی زبان کے الفاظ کو ٹھونسے گا تو نہ صرف ایسے الفاظ کے
استعمال پر ہنسی آئے گی بلکہ ایسا استعمال اردو کے حق میں افسوسناک
بھی ہوگا۔"

ربندر ناتھ نے جو اصطلاحات وضع کئے ہیں اگر ہم ان پر غور کریں تو ایسے کئی الفاظ
پائیں گے جن کے لئے انہوں نے اردو، فارسی یا عربی الفاظ (جو عام طور پر بنگلہ میں رائج ہیں) کی مدد
بھی لی ہے مثلاً Sympathy کے لئے انہوں نے لفظ درد کا استعمال کیا جو عام طور پر اس معنیٰ
میں بنگلہ زبان میں آتا ہے جب کہ ادبی طور پر ایک اور لفظ "سہانو بھوتی" بھی ہے لیکن
لفظ "سہانو بھوتی" کے بجائے ربندر ناتھ نے "درد" (بنگلہ تلفظ دَرد) کو بہتر قرار دیا چونکہ یہ عام
فہم ہے، مختصر ہے، سہل ہے اور عام لوگوں کی زبان پر بمعنی Symathy کے استعمال میں آتا
ہے اسی طرح ربندر ناتھ نے customs House کے لئے ماشول خانہ (محصول خانہ)
Terminus کے لئے ٹرمنس مقام (آخری مقام) Application کے لئے "درخواست"
Park کے لئے "آرام باغ" Sleeping partner کے لئے "گھومنتو شریک" اور ——
un employed کے لئے بے کار جیسے اصطلاحات وضع کئے ہیں جو عربی فارسی اور اردو
کی مدد سے بنائے ہوئے الفاظ ہونے کے باوجود بنگلہ زبان کے مزاج کے مطابق ہیں۔

کونسی زبان ذریعہ تعلیم ہونی چاہیئے کے سلسلے میں ربندر ناتھ کا خیال آفتاب کی طرح
روشن ہے اور انہوں نے بار بار اس خیال کو دہرایا ہے کہ ذریعہ تعلیم بچے کی مادری زبان ہونی
چاہیئے اور کوئی زبان مادری زبان سے تعلیم کے سلسلے میں زیادہ مفید نہیں ہو سکتی ہے۔ انہوں
نے مادری زبان کو "ماں کا دودھ" کہا ہے جو بچے کی صحت کے لئے بنیادی ضرورت ہے۔ آج دنیا کا
ہر ماہر تعلیم اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ ربندر ناتھ نے نہ صرف ابتدائی تعلیم بلکہ یونیورسٹی یعنی اعلیٰ
تعلیم کے لئے بھی مادری زبان ہی کو بہترین قرار دیا ہے۔ وہ آگاہ تھے کہ ان کے اس خیال کی مخالفت
کی جائے گی۔ چونکہ ان دنوں انگریزی سرکاری زبان تھی یعنی انگریزی روٹی روزگار کی کنجی تھی اور انگریزوں
کی پالیسی یہی تھی کہ چند ہندوستانی اتنی انگریزی زبان جان لیں کہ سرکاری کام کاج میں ان کا ہاتھ

بتا سکیں لیکن مقام افسوس تو یہ ہے کہ آزادی کے اتنے سالوں کے بعد بھی ہمارے ملک میں ابھی تک ربندر ناتھ کے خیال کو عملی شکل نہیں دی گئی ہے آج بھی ہندستانی بچے تمام تر تعلیم اپنی مادری زبان میں نہیں پاتے ہیں۔ ربندر ناتھ کے زمانے میں ان کے خیال کی مخالفت جن بنیادوں پر کی گئی تھی آج بھی مادری زبان میں تعلیم دینے کے سلسلے میں تقریباً وہی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ ربندر ناتھ نے لکھا ہے۔

"مجھے علم ہے مخالفت ہوگی، بحث و مباحثہ ہوگا کہ میں بنگلہ زبان میں اعلیٰ تعلیم تک کا طرفدار کیوں ہوں، بنگلہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کتابیں کہاں ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ نہیں ہیں۔ لیکن نصابی کتابیں باغ کے حسین پودے تو نہیں کہ شوقین لوگ شوق سے لگائیں گے یا یہ گھاس یا دوب بھی نہیں ہیں کہ خودبخود میدان میں اگیں گے۔ اگر تعلیم کو نصابی کتابوں کے لئے انتظار کرتے رہنا پڑے، بیٹھا رہنا پڑے ــــــ تو اس سے افسوس ناک اور کیا ہو سکتا ہے۔؟"

تعلیم کے سلسلے میں ربندر ناتھ کے خیالات کو پیش کرتے ہوئے کھوکیش مونترا نے لکھا ہے[1]:۔

"ٹھاکر نے مسئلہ تعلیم پر کافی غور و فکر کیا۔ تعلیم کی ماہیت، مدعا، مقصد، تعلیمی ادارے اور طریقۂ تعلیم وغیرہ وغیرہ پر۔ ان کا طرز عمل نہایت سائنسی تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے نظریاتی منصوبوں یا تجاویز کو عملی طور پر پرکھ کر دیکھتے۔ یہ بات خاص کر ان کے تعلیمی نظریات پر صادق آتی ہے انہوں نے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ نصابی کتابیں لکھیں، خود طلبا کو پڑھایا اور طلبا و اساتذہ کا ایک گروہ تیار کیا جس میدان کے وہ سالار بنے۔ لہٰذا وہ پوری دنیا میں ایک عظیم معلم کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔"

---

[1] انگریزی پندرہ روزہ "ویسٹ بنگال" ربندر ناتھ نمبر ۹ مئی ۱۹۷۶ء کلکتہ، ص ۱۷

تعلیم کے سلسلے میں ٹھاکر نے جو مضامین لکھے ان میں "شکھار ہیر پھیر" (تعلیم میں ہیر پھیری) اور "شکھا رباہن" (ذریعۂ تعلیم) دو نہایت اہم مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ مجموعۂ مضامین "شکھا" (تعلیم) میں چند اور مضامین بھی ہیں پھر وشوا بھارتی اور دیگر یونیورسیٹوں میں انہوں نے تعلیم پر کئی لکچر دیئے۔ انہوں نے بتایا کہ برٹش حکومت نے اپنے طبقے کے مفادات کو مدنظر رکھ کر جس طریقۂ تعلیم کو رائج کیا اس کے نتیجے میں ایک طرف شہر کے چند افراد نے لکھنا پڑھنا سیکھا تو دوسری طرف گاؤں گاؤں کے لاکھوں عوام اس تعلیم سے بھی محروم رہے۔ شاعر ٹھاکر جب زمینداری کی دیکھ بھال کے سلسلے میں شلائی دواہ میں رہتے تب وہ گاؤں والوں کی زندگی سے نہایت قریب ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ ٹھاکر نے صاف کہا۔

"ہمارے ملک میں دونوں وقت دو مٹھی بھر کھانا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور بیشتر لوگ ادھ پیٹ کھا کر قسمت کی دہائی دیتے ہوئے کسی طرح رینگتے رینگتے زندگی کو موت تک گھسیٹ لے جاتے ہیں ۔۔۔۔ موجودہ تعلیم کی ملکی لونڈا باندی سے صرف سماج کی اوپری سطح کی زمین کا ایک دوانچ ہی کچھ نم ہو پاتا ہے اور اس سے نیچے کی مٹی آج بھی خشک ہے ۔۔۔۔ شہر کے چند باشندوں کو "نئی تعلیم" حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ ان کو عزت ملی، دولت ملی وہ روشن ہوئے اور اس روشنی کے بدلے باقی پورے ملک میں گہن لگ گیا، تاریکی چھا گئی۔ اسکول کے بنچ پر بیٹھ کر جن لوگوں نے انگریزی رٹ لی ہے انہوں نے اس اندھی تعلیم سے یہ جانا کہ "دیش" کے معنی ہیں "چند شہری تعلیم یافتہ سماج کے افراد" ہیں ۔۔۔۔"

رابندر ناتھ نے ہندستانیوں کو ایسی انگریزی تعلیم دینے کی سخت مخالفت کی ہے۔ انہوں نے لکھا :-

"چاہے ہم بی۔ اے، ایم۔ اے پاس کریں، ڈھیر کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی عقل کے دروازے نہیں کھلتے ـــــ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بچپن سے ہمیں جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں کوئی مسرت شامل نہیں ہے ہم صرف ان باتوں کو جو امتحان میں کامیابی کے لئے ضروری ہے رٹ لیتے ہیں۔ اس سے کسی طور پر کام نکالا جا سکتا ہے لیکن اس سے ذہنی نشو و نما نہیں ہو پاتا۔"

انگریزی زبان ہندستانی بچوں کے لئے کتنی غیر فطری زبان ہے اس کی کئی دلچسپ مثالیں (انگریزی تلفظ اور املا کے متعلق) دیتے ہوئے ٹھاکر نے لکھا۔

"انگریزی حکومت میں قدم قدم پر قانون ہے (چاہے ان پر عمل ہو یا نہ ہو) لیکن اگر کہیں کوئی اصول یا قانون نہیں ہے تو وہ انگریزی کی فسٹ بک (First Book) ہے۔"

ٹھاکر کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو مادری زبان سے ان کی بے پناہ محبت کے جذبات قدم قدم پر نظر آئیں گے اور مادری زبان سے یہ محبت ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ٹھاکر گھرانے میں سب کام کاج بنگلہ زبان میں ہوتا تھا۔ مہرشی دیویندر ناتھ کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی بنگالی ان کو انگریزی میں خط لکھتا تو وہ اس خط کا جواب نہیں دیتے تھے۔[1] ان دنوں جب کانگریس کے جلسوں میں کوئی لیڈر کسی دیسی زبان میں تقریر کرنے کا خیال تک نہیں کر سکتا تھا۔ تب "ناٹور کانگریس" کے اجلاس میں رابندر ناتھ نے یہ ہمت کی اور انگریزی کے بدلے بنگلہ میں تقریر کی۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکے کہ بنگال کی سرزمین پر اجلاس ہوا اور اس کی پوری کارروائی انگریزی میں ہو۔ اسی کے خلاف بطور احتجاج رابندر ناتھ نے اپنی مادری زبان بنگلہ میں تقریر کی تھی۔ حالانکہ اجلاس میں شریک ہونے والے کئی لیڈروں سے ان دنوں بھی وہ بہتر انگریزی جانتے تھے۔

---

[1] بنگلہ ہفت روزہ "پچھم بنگا" مضمون "مادری زبان میں تعلیم کے سلسلے میں رابندر ناتھ" از۔ نارائن چودھری ۹ مئی ۱۹۷۹ء

ٹیگور گاندھی جی کے ہمراہ

سودیشی تحریک کے دلوں چند رہنماؤں نے سرکاری طریقۂ تعلیم کی مخالفت کی اور اپنے طور پر دیسی تعلیمی ادارے قائم کرنے پر زور دیا۔ رابندر ناتھ کے شانتی نکیتن کا منصوبہ بھی اسی طرح کا ہے انہوں نے لکھا ہے

"ہم لوگ اسکولوں کے ذریعہ اس ملک میں غلامی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے کسی طور پر راضی نہیں ہو سکتے۔ لہذا اب وقت آگیا ہے کہ تعلیمی اداروں کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لیں ـــــ صرف ملازمت کے لئے نہیں بلکہ انسان بنانے کے لئے تعلیم کو عام کرنا ہوگا۔ لہذا تعلیم کو مکمل طور پر آزاد کرنے کے دن آگئے ہیں اور اب اس سلسلے میں کوئی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔"

اس دور کے اسکولوں کا ذکر کرتے ہوئے ٹھاکر نے لکھا۔

"اسکول تعلیم کا ایک کارخانہ ہے اور ماسٹر اس کارخانے کا ایک حصہ۔ ۱۰½ (ساڑھے دس) بجے گھنٹا بجا کر اس کارخانے کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور کارخانہ چلنے لگتا ہے۔ ماسٹر کی زبان چلنے لگتی ہے، چار بجے یہ کارخانہ بند ہوتا ہے۔ ماسٹر نامی مشین کی زبان رک جاتی ہے، طلبا کارخانے میں تیار شدہ دو چار کاغذی علم (اوراق پر لکھ کر) لے کر گھر لوٹ آتے ہیں۔ اس کے بعد امتحان کے دلوں اس علم کی جانچ ہوتی ہے اور نمبر دیئے جاتے ہیں ـــــ دس تا چار جو زبانی یاد کرنا ہوں، اس تعلیم کا کوئی میل، کوئی رشتہ، کوئی تعلق باوجود تلاش کرنے کے نہیں پاتا ـــــ ایسی حالت میں اسکول محض ایک مشین ہے، جو سامان تیار کرتی ہے اس میں جان نہیں ڈالتی ـــــ وہ اسکول جہاں طلبا کے رہنے سہنے کا انتظام ہے اسے بورڈنگ اسکول

کلیات ٹھاکر۔ وشوا بھارتی ایڈیشن۔ جلد نمبر ۱۲۔ صفحات نمبر ۲۹۲-۲۹۳

کہتے ہیں۔ اس بورڈنگ اسکول سے جو تصویر دل میں ابھرتی ہے وہ
بھی دلکش نہیں ہے۔ بیارک، پاگل خانہ، ہسپتال یا جیل خانہ کی
طرح وہ بھی محض ایک اور " خانہ " ہی ہے ۔"

سامراجی طرز تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے ۱۹۲۰ء میں بھرپور طنز کرتے ہوئے "طوطا کہانی" کے عنوان سے جو افسانہ لکھا اس سے ان کی تعلیمی پالیسی واضح ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان عالی شان عمارتوں میں (یونیورسٹی) جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے انسانی دل مرجاتا ہے۔ افسانے میں طوطا طالب علم ہے جس کو سونے کے پنجرے میں قید کرکے تعلیم دی جاتی ہے لیکن آخرکار وہ طوطا پنجرے ہی میں مرجاتا ہے۔

بہرحال سودیشی تحریک کے دنوں جب یہ خیال ابھرا کہ عوام کو مادری زبان میں تعلیم دینے کی ذمہ داری خود ہندستانیوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیے تو رابندرناتھ میدان عمل میں آئے اور اس کام میں (شانتی نکیتن میں تعلیم دینے میں) اوپادھیائے اور بیچارام نے ان کا ساتھ دیا۔ خود ٹھاکر بھی ایک استاد تھے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ گاندھی جی نے رابندرناتھ کو "گرودیو" کا لقب دیا اور وہی پہلے پہل ان کو "گرودیو" کہنے لگے تھے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے چونکہ خود ٹھاکر نے لکھا ہے کہ ان دنوں جب وہ شانتی نکیتن میں پڑھانے لگے اوپادھیائے نے ان کو گرودیو کا لقب دیا جس لقب سے آشرم کے طلبا اور دیگر اساتذہ ان کو بلایا کرتے تھے۔ شانتی نکیتن آشرم کا جو اولین نقشہ ٹھاکر کے ذہن میں ابھرا وہ انہوں نے وید، اپنشد اور گوتم بدھ کی تعلیمات سے استفادہ کیا تھا۔ نیچرل (قدرتی) ماحول میں، شہر کے ہنگاموں سے دور آشرم میں طلبا کی زندگی کو ساتھ رکھ کر، اسے پرسکون ماحول میں، جدید زندگی کی ضرورتوں کے مطابق تعلیم یعنی "تپ بن" کی تعلیم سے یا رشی آشرم کی تعلیم سے یہ طریقہ مطابقت رکھتا تھا۔ یعنی اس تعلیم کا سانچہ اور ماحول عہد قدیم کے مطابق تھا۔ لیکن موجودہ عہد کی ضرورتوں کو

---

۱ بنگلہ ماہنامہ "پرباسی" ماہ آشن ۱۳۴۰ مطابق ۱۹۳۴ء صفحہ ۷۴۴۔ رابندرناتھ کا مضمون "آشرم میں تعلیم کی ابتدا" ———

نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ٹھاکر نے سماج کو سینکڑوں سال پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش نہیں کی ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اگر ان کا خیال ایسا ہوتا تو وہ تمام جدید علوم کی طرف ہرگز متوجہ نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود شانتی نکیتن کی تعلیم قدیم آشرا کی نقل ضرور تھی اور اس پر "ہندو مذہب" کی چھاپ تھی لہذا ان دونوں اُن پر تنقیدیں بھی ہوئی ہیں۔

"حیات ٹھاکر" کے مصنّف پربھات کمار مکھوپادھیائے نے لکھا ہے ؎

"ربندر ناتھ نے جس تعلیم کو قومی تعلیم کہا ہے وہ درحقیقت ہندوؤں
کا برہم چاریہ آشرا کا طریقہ ہے جسے شانتی نکیتن میں اپنایا گیا۔ اس
وقت تک شانتی نکیتن کے آدرش میں ہندوؤں کے علاوہ کسی اور
مذہب کے لوگوں کے لئے جگہ نہیں تھی حتیٰ کہ برہمن کو بھی جگہ ملنا مشکل تھا
لہذا رابندر ناتھ کے اس آدرش (نقطۂ نظر) کو تمام مذاہب والے
قبول نہیں کر پائے اور اسی لئے اسے "قومی" نہیں کہا جاسکتا۔"

جب ٹھاکر نے "مسئلہ تعلیم" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تب کئی دانشوروں نے ان کے اس آشرمی فلسفہ کی مخالفت کی اور اسے محض "ہندو آشرم" قرار دیا (مثلاً رسالہ بھانڈار" ماہ جیٹھ ۱۳۱۳ بنگلہ سنہ مطابق ۱۹۰۶ء میں جیوندر کماردت کا مضمون) رابندر ناتھ پر جو تنقیدیں ہوئیں اس پر انہوں نے غور کیا اور محسوس کیا کہ انہوں نے غلطی کی ہے۔ رابندر ناتھ کی ایک بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ اگر وہ دیکھتے کہ ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے۔ اور پھر سدھارنے کی پوری کوشش کرتے۔ یہ ان کی عظمت کی ایک ادرشانی ہے لہذا انہوں نے اگلا قدم اٹھایا اور وشوا بھارتی کا منصوبہ بنایا اور اس طرح اپنے تعلیمی مرکز کا دروازہ دنیا بھر کے لئے کھول دیا جو بلا امتیاز رنگ، نسل، مذہب، خاص و عام ہر ایک کے لئے ایک جامعہ علوم بنا اور جس میں عربی فارسی اور اردو کا شعبہ بھی قائم ہوا لیکن یہاں طلبا کو محض اسباق رٹ کر امتحان میں کامیاب ہونا ہی نہیں تھا۔ ان کی ودیالیہ (تعلیم گاہ)

؎ حیات ٹھاکر۔ جلد دوم۔ مصنّف: پربھات کمار مکھوپادھیائے۔ صفحہ ۱۵۰

کے ساتھ "سری نکیتن" بھی شامل رہا۔ کچھ زمین جہاں طلبا اسکول کی ضرورت کے لیے کھیتی باڑی کرتے۔ کاشت کاری، باغبانی، مویشی پالنے کے علاوہ یہاں دست کاری کی تعلیم بھی دی جاتی۔ یہی نہیں بلکہ طلبا کے رجحان کے مطابق ان کو رقص و موسیقی اور مصوری کی تعلیم بھی دی جاتی۔ ربندر ناتھ نے مضمون "وشوا بھارتی" میں لکھا ہے[1]

ہمارے ملک میں یہاں وہاں، دور دور چند یونیورسٹیاں ہیں۔ وہ بندھے ٹکے اصولوں پر مشینی طریقے پر ڈگری تیار کرنے کے کارخانے ہیں۔ اس تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل وغیرہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جو لوگ پیشہ ورانہ تاجر ہیں لیکن سماج میں حق کے لیے، خدمت کے لیے اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر دل سے کام کرنے کا جذبہ اس تعلیم سے نہیں ابھر رہا ہے—— میں نے جس مقصد کے تحت شانتی نکیتن آشرم قائم کیا۔ اس کی منزل اور ہے۔ ہماری تہذیب رنگ برنگی ہے—— اس تہذیب کی کئی شاخیں ہیں، کونپل ہیں —— میری خواہش یہی رہی ہے کہ میں اس تہذیب کی تمام شاخوں کو اس آشرم میں پروان چڑھاؤں۔ ہمارے ملک میں نصابی کتابوں کا دائرہ نہ صرف محدود ہے بلکہ گیان (علم) کی مختلف شاخوں کا تعلق اس نصاب تعلیم میں نہیں ہے۔ مثلاً دست کاری، مصوری، رقص، گیت، ڈرامے اور دیہی علاقوں کی بہبود کے لیے جیسی تعلیم کی ضرورت ہے وہ سب اس تہذیب کے تحت آتے ہیں مکمل طور پر دل کی کلی کھلنے کے لیے ان تمام چیزوں کی ضرورت ہے جس طرح غذا میں مختلف چیزیں کھانے سے ہماری صحت اور تندرستی قائم رہتی ہے! اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ

---

[1] رسالہ "پرباسی" ماہ پوش ۱۳۴۵ مطابق ۱۹۳۸ء

وہ تمام انسانی علوم و فنون جو دل و دماغ کو قوت بخشتے ہیں، کی
تعلیم اس آشرم میں دی جائے۔"

دورۂ سوویت روس کے دوران انہوں نے خاص کر وہاں کے تعلیمی نظام پر غور کیا اور جو کچھ دیکھا اس کے سلسلے میں کھلے الفاظ میں لکھا "ایک دم بنیادی فرق ہے" انہوں نے لکھا:۔

"زمانے تک اکثریت تعلیم کی سہولتوں سے محروم تھی۔ ہندستان میں تو
تقریباً سب ہی محروم ہیں۔ لیکن یہاں پورے سماج میں تعلیم پھیلی ہے
جو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ـــــ میں اگر اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھتا
تو کسی طرح یقین نہیں کرتا کہ صرف دس سال میں سماج کے نچلے طبقے
کے لاکھوں لاکھ لوگوں کو یہاں حرف الف، ب، ج، دال ہی سکھایا
نہیں گیا ہے بلکہ وہ انسان بنے ہیں۔"

بہر حال تعلیمی میدان میں وشوا بھارتی ربندر ناتھ کی کامیابی کا پرچم آج بھی لہرا رہا ہے اور نہ صرف ہندستان کی تاریخ میں بلکہ پورے عالم میں ربندر ناتھ ٹھاکر جیسا کوئی فرد واحد نظر نہیں آتا۔ جس نے تا عمر عوام کی تعلیم کے مختلف مسائل حل کرنے اور تعلیم کو عام کرنے اور مادری زبان میں تعلیم دینے کے لئے جدوجہد کی ہو۔ وشوا بھارتی قائم کرنے اور اس کی ترقی کے لئے انہوں نے نہ صرف نوبل انعام کا روپیہ خرچ کیا بلکہ اپنی جائداد اور شریک حیات کے زیورات تک فروخت کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ جب اس سے بھی ضروریات پوری نہیں ہو پائیں تو اپنی تخلیقات کی رائلٹی وشوا بھارتی کے نام کر دی اور یہیں یہ داستان ختم نہیں ہوتی بلکہ فروغ تعلیم کے لئے وہ بھیک کی تھیلی لئے دنیا بھر میں دور دور تک بھیک مانگتے رہے۔ یہ ہے ٹھاکر کی علم دوستی۔ افسوس کہ اس عظیم انسان دوست کا یہ خواب کہ تعلیم عام ہو، عوام کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے اور تعلیم کا مقصد صرف پڑھنا لکھنا نہیں، بلکہ انسان بنانا ہو۔ یہ عظیم خواب آزادی کے برسوں بعد آج بھی محض ایک خواب ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ستر (۷۰) کروڑ ہندستانیوں میں سے ۴۴ کروڑ لوگ ابجد شناس نہیں

ہیں، تعلیم اور اعلیٰ تعلیم پانا تو دور کی بات ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق مردوں میں ۶۴ فیصد اور عورتوں میں ۸۷ فیصد آج بھی ابجد آشنا نہیں ہیں اور حکومت کے اعداد و شمار یہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں شریک ہونے والے سو طلبا میں سے ۷۷ طلبا آٹھویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے اور ۸۸ طلبا دسویں جماعت سے پہلے تعلیم سے کنارا کش ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔[۱]

প্রত্যভিনন্দন

বক্সা দুর্গস্থিত রাজবন্দীদের প্রতি

নিশীথেরে লজ্জা দিল অন্ধকারে রবির বন্দন।
পিঞ্জরে বিহঙ্গ বাঁধা, সঙ্গীত না মানিল বন্ধন।
ফোয়ারার রন্ধ্র হোতে
উন্মুখর ঊর্ধ্ব স্রোতে
বন্দী বারি উচ্চারিল আলোকের কী অভিনন্দন॥

মৃত্তিকার ভিত্তি ভেদি' অঙ্কুর আকাশে দিল আনি
স্বসমুত্থ শক্তিবলে গভীর মুক্তির মন্ত্রবাণী।
মহাকাল রুদ্রাণীর
কী বর লভিল বীর,
মৃত্যু দিয়ে বিরচিল অমর্ত্য নরের রাজধানী॥

"অমৃতের পুত্র মোরা" কাহারা শুনালো বিশ্বময়!
আত্মবিসর্জন করি' আত্মারে কে জানিল অক্ষয়!
ভৈরবের আনন্দেরে
দুঃখেতে জিনিল কে রে,
বন্দীর শৃঙ্খলছন্দে মুক্তের কে দিল পরিচয়॥

১৩ জ্যৈষ্ঠ
১৩৩৮

শ্রীরবীন্দ্রনাথ ঠাকুর
দার্জিলিং

۱ ماہنامہ ''جوبہ شکتی''۔ اپریل، مئی ۱۹۸۶ء۔ کلکتہ۔ ص ۱۹

ٹیگور نہرو کے ہمراہ

مذہب اور فرقہ پرستی کے مسائل

رابندر ناتھ ہر طرح کی فرقہ پرستی کے خلاف تھے۔ انہوں نے ذات پات، چھوت چھات کے خلاف بہت کچھ لکھا اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ وہ سامراج دشمن تھے لیکن سامراجی ملکوں کے عوام سے ان کو محبت تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف تھے اور ہندستان کی جنگ آزادی کے لئے لڑتے رہے ہیں۔ لیکن وہ انگریز عوام کے خلاف نہیں تھے۔ انگریزوں کی خوبیوں کا وہ احترام کرتے رہے —— رابندر ناتھ کے دور میں ہمارے یہاں ہندو مسلم فرقہ پرستی ہی سب سے اہم مسئلہ رہا ہے اور آج بھی یہ ہمارے لئے ایک اہم مسئلہ ہے لہذا ذیل میں فرقہ پرستی کی دیگر شکلوں کے سلسلے میں ٹھاکر کے خیالات پیش کرنے کے بجائے صرف ہندو مسلم فرقہ پرستی کے سلسلے میں ٹھاکر کے خیالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کسی فنکار کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ فنکار کا شعور تاریخی اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ، رفتار زمانہ کے ساتھ، درست طور پر آگے بڑھا ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس نے وقت کے دھارے کو سمجھ کر، سماج کو (اپنی تخلیقات سے) آگے لے جانے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔ اس پس منظر میں جب ہم ٹھاکر کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف وقت کی اہم ضرورتوں کو سمجھا تھا۔ نہ صرف ان کا تاریخی شعور بیدار تھا بلکہ وہ اپنے وقت سے (کم از کم ہندستانی ماحول میں) کم و بیش نصف صدی آگے تھے۔ ان کا تاریخی، سماجی اور سیاسی شعور سودیشی تحریک کے دنوں (۱۹۰۶ء) ہی اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو گئے تھے کہ ہندستان کی ترقی بغیر ہندو مسلم اتحاد کے ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد سے تاحیات وہ بار بار اس پر زور قلم صرف کرتے رہے۔ کاش، ٹھاکر کے خیالات سے ہمارے سیاسی رہنما سبق لیتے، ٹھاکر کی باتوں کو تسلیم کر لیتے اور ان پر عمل کرتے، تو آج ایک ہندستان تین ملکوں میں تقسیم نہ ہوتا، اور

ہندستان دنیا کی ایک اتنی بڑی طاقت ہوتی کہ کوئی سامراجی طاقت ہندستان کی طرف نظر بد سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتی۔ تقسیم ہونے کے بعد بھی فرقہ پرستی کا بھوت آج بھی مرا نہیں ہے، یہ ہم سب جانتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فرقہ پرستی ہے جس کی مختلف صورتیں ہمارے سماج میں زندہ ہیں اور رہ رہ کر بار بار ابھر آتی ہیں۔

سودیشی تحریک کے دنوں (۱۹۰۶ء) اس تحریک میں عملی حصہ لیتے ہوئے ربندرناتھ نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندو اور مسلمان یہاں دو بڑے مذہبی فرقے ہیں، دو بڑی طاقتیں ہیں اور ان دونوں میں اتحاد نہ ہو تو ہندستان ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ربندرناتھ کے سلسلے میں یہ ایک بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ کٹر مذہبی آدمی تھے حالانکہ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے (پچھلے صفحات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے کسی اقدام کو غلط محسوس کرنے پر، اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے طریقے میں تبدیلیاں کی ہیں) صرف اتنا سچ ہے کہ ابتدا میں وہ کٹر برہمو سماجی تھے اور برہمو سماج کے صدر بھی ہوئے تھے۔ برہمو سماج اس عہد میں کٹر ہندو برہمن سماج کا مخالف تھا اور اس لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قدم تھا، لیکن ربندرناتھ کی زندگی میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء تک آتے آتے، شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات بدلتے گئے، اور ان میں وید اور اپنشد ہی نہیں حتیٰ کہ تصور خدا کے سلسلے میں بھی شک و شبہہ پیدا ہو گیا تھا اور برہمو سماج سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ ان کے یہ اشعار ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں:۔

"آج اپنے دل میں سوچتا ہوں\
کون ہے، میرا دیوتا —— ؟\
کس کی پوجا کی ہے —— ؟

....

میں مذہبی فرائض کا قائل نہیں ہوں\
میں کسی منتر کا پابند نہیں ہوں\
میں "لامنتر" ہوں"

ٹھاکر نے ایک خط میں شریمتی موتنریا دیوی کو لکھا:۔

"میں کسی دیوتا کے تخیّل کو اپنا کر اس سے پیار کرنا نہیں کر سکا اپنے سے اپنے کو آزاد کرنا مکت کرنے کی دشوار کوشش میں ہوں"۔[1]

پھر اپنے تصوّر خدا کے سلسلے میں انہوں نے لکھا:۔[2]

میرا بھگوان انسان سے پرے ہٹ کر نہیں ہے وہ انسان ہے، مدورا کے مندر میں جب لاکھوں لاکھ روپیوں کے زیورات مجھے دکھائے گئے تب میری گردن شرم سے جھک گئی جب کہ ایک طرف حقیقی بھگوان، انسان، نہایت کمزور، محض ہڈیوں کے ڈھانچوں کی طرح انسان دونوں ہاتھ پھیلائے اس مندر کے باہر راستوں پر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ تب تم مجھ سے کہتے ہو میں اس بھگوان کی پوجا کروں، جو مندر میں ہے ـــــ تم مورتی کی پوجا کرنے کو کہتے ہو، حقیقت تو دروازے پر کھڑی ہے۔ زمانے سے انتظار کر رہی ہے۔ اگر دروازوں کو بند کر کے مورتی کی پوجا کرنے کو کہو تو اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے ـــــ"

رابندر ناتھ نے ہر مذہب کا مطالعہ کیا تھا۔ اسلام کا بھی۔ مضمون "مشرقی سماج" میں حضرت محمدؐ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:ـــــ[3]

"ایک مہا پُرش (عظیم انسان) جو قدیم روایات کے ڈھانچے کو توڑ کر نئے اصول لے آتا ہے۔ بعد میں وہی اصول دیکھتے دیکھتے سخت بن جاتے ہیں اور ہمیں قید کر لیتے ہیں، بند کر دیتے ہیں دھرتی

---

[1] ماہنامہ "بسومتی" رابندر ناتھ نمبر اپریل، مئی "۱۹۸۶ء" ص ۳۲

[2] ۔ ہفتہ وار "پچھم بنگہ" رابندر ناتھ نمبر ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء ص ۱۰۲

[3] ۔ رسالہ "یوجنا شکتی" رابندر ناتھ نمبر اپریل، مئی ۱۹۸۶ء ص ۹

پر جنم لے کر اپنے طور پر، اپنی خواہش کے مطابق، اپنے لئے مفید
غذا حاصل کرنا (مذہب کے سخت بندھن میں قید ہو جانے کی وجہ
سے) دشوار ہو جاتا ہے۔ حضرت محمدؐ نے قدیم عرب کے کچھ فرسودہ
اصولوں کو دور کر کے وہاں کے لوگوں کو جس مقام پر لا کھڑا کیا
تھا، وہ لوگ وہیں کھڑے رہے اور وہاں سے ہلے تک نہیں۔"

اور رابندر ناتھ نے مضمون "ہندو مسلمان" میں افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے۔[1]

"جس ملک میں خاص کر مذہب کی بنیاد پر ہی لوگ پہچانے جاتے
ہیں۔ مذہب ہی جہاں اتحاد اور ملن کا پل ہو، جہاں اور کوئی بندھن
ان کو آپس میں باندھ رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا، وہ ملک نہایت
ہی بدنصیب ہے وہ ملک مذہب کی بنیاد پر جو بھید پیدا کرتا ہے، وہی
اختلاف سب سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتا ہے۔"

ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مضمون "مسائل" میں
لکھا۔[2]

"ہندو اپنے کو مذہب کا پابند کہا کرتے ہیں اور مسلمان بھی یہی کہتے
ہیں، یعنی دونوں کی زندگی کا بہت کم ہی حصّہ دائرہ مذہب سے باہر رہتا
ہے اسی لئے یہ دونوں اپنے اپنے دھرم کی نظر ہی سے ایک دوسرے کو
اور پھر دنیا کے دیگر لوگوں کو، جہاں تک ہو سکے دور دھکیل دیتے ہیں
یہ جو فاصلہ ہے، یہ جو دوری ہے جس کو ان لوگوں نے اپنے اطراف بہت
مضبوطی سے تعمیر کر رکھا ہے اس سے دیگر سب لوگوں سے ان کا حقیقی
لگاؤ، اور ان میں انسانیت کا پھیلاؤ ہونے میں رکاوٹیں پڑتی ہیں۔"

---

[1] ماہنامہ "پرباسی" بنگلہ سنہ ساون ۱۳۳۸ مطابق ۱۹۳۱ء

[2] رسالہ "جوباشکتی" رابندر ناتھ نمبر ۱۹۸۶ء ص ۶

تاریخ عالم پر رابندر ناتھ کی نظر نہایت گہری تھی! انہوں نے لکھا کہ ہر سیاسی انقلاب مذہب کے کٹرپن پر وار کرتی ہے اور آئندہ بھی کرے گی۔ وہ لکھتے ہیں :

"تاریخ میں یہ بار بار دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بھی کسی ملک میں سیاسی انقلاب آیا، اس کے ساتھ وہاں مذہب کے کٹرپن پر زبردست وار کیا گیا ـــــ فرانسیسی انقلاب میں اس کی مثال ملتی ہے۔ سوویت روس بھی موجودہ مذہبی خیالات کے خلاف ہے حال ہی میں اسپین میں بھی مذہب کے خلاف آگ بھڑک اٹھی ہے میکسیکو کی بغاوت نے بار بار رومن چرچ پر حملے کئے ہیں"[۱]

رابندر ناتھ ٹھاکر نے تاریخ کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ ہندستان کی دھرتی پر ملکی اور غیر ملکی کئی ذاتوں کا ملن "برہمنی عہد" سے پہلے ہوا تھا۔ پھر برہمنیت کے قدم مضبوطی سے سماج میں جم گئے۔ برہمنیت کے سخت اصولوں نے ہندو سماج کے دروازوں کو دیگر ذات پات والوں کے لئے، دیگر مذہبی عقائد رکھنے والوں کے لئے بند کر دیا! اس برہمنی ہندو سماج نے ایسی اونچی اور آہنی دیواریں کھڑی کیں اور ایسے رسم و رواج بنائے کہ پورا ہندو سماج ان دیواروں میں قید ہو کر رہ گیا اور دیگر فرقے یا مذاہب کے لوگ اس سماج کے قریب نہیں ہو سکے اور نہ ہی اس برہمنی ہندو سماج نے دیگر لوگوں کو قریب آنے کا موقعہ دیا۔ ٹھاکر کے مطابق یہیں سے ہماری فرقہ پرستی کا مسئلہ شروع ہوا ہے۔ لیکن ٹھاکر کسی سلسلے میں "نا امیدی" کو اپنے قریب تک آنے نہیں دیتے تھے! انہیں انسان پر ہمیشہ بھروسہ رہا ہے اور انہوں نے انسان کی انسانیت پر یقین نہ رکھنے کو "گناہ عظیم" قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہندستان کے دو بڑے مذہبی گروہ یعنی ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب لانے، ایک دوسرے کو سمجھنے اور ان میں ملن اور جذبۂ اتحاد پیدا کرنے کی انہوں نے عملی طور پر بھرپور کوشش کی۔ جنگ آزادی کے ابتدائی دور میں جب پہلے پہل فرقہ پرستی کے جذبات کی ہلکی جھلک دکھائی دی تھی، تب ہی انہوں نے خطرے کی گھنٹی دور سے سنی تھی! انہوں نے دیکھا تھا کہ سودیشی تحریک مسلمانوں کے

---

[۱] رسالہ "پرباسی" بنگلہ سنہ ۱۳۳۸ ۔ مطابق ۱۹۳۱ء

دل کی گہرائیوں میں اتر نہیں پائی ہے اور اس ناکامی کا الزام انہوں نے ہندوؤں پر عائد کیا اور ہندوؤں کی قدامت پسندی کو اس کے لئے ذمہ دار قرار دیا۔

ان دنوں جب ربندر ناتھ اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کے سلسلے میں وہیں بنگال میں تھے تب پہلی بار ان کی نظروں میں یہ بات کھٹکی کہ برہمنی ہندو سماج نفرت بھری نظروں سے مسلمانوں کو دیکھا کرتی ہے (یہاں یہ خیال رہے کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور خاص کر کسانوں میں بھاری اکثریت ہے) انہوں نے اپنے بیٹھک خانہ میں جا کر دیکھا تو ان کو حیرت ہوئی کہ ان کی زمینداری کی دیکھ بھال کرنے والے برہمن نائب نے مسلمان پرجا کے بیٹھنے کی جگہ کچھ دوری پر الگ بنائی ہے اور یہیں سے ٹھاکر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو اس طرح دور رکھنے کی وجہ سے سیاسی پلاٹ فارم پر بھی مسلمان ہندوؤں سے دور رہنے لگے ہیں ربندر ناتھ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں سے اس نفرت کی وجہ سے وہ ہندوؤں سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں اور ہندوؤں کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت جم رہی ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ٹھاکر نے عملی زندگی میں اپنی روزمرہ کی زندگی میں مسلمانوں کو اپنے قریب لانے کی کوشش شروع کر دی تھی آن نداشنکر رائے جو ۱۹۱۳ء میں نوگاؤں ضلع راجشاہی کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ تھے، ربندر ناتھ سے ملنے ان کی زمینداری کے علاقے میں گئے تھے انہوں نے ٹھاکر سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا[1] کہ "ربندر ناتھ کی موٹر بنگھی کشتی، جس میں وہ رہتے اور سفر کرتے تھے اس کے سب کے سب ملازمین مسلمان تھے۔ یہی ملازمین ربندر ناتھ کے لئے کھانا پکاتے تھے اور ان لوگوں نے ہمارے لئے بھی کھانا پکایا"۔ ٹھاکر نے اپنے[2] سلسلے میں لکھا ہے:۔

"سب سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ میرے کردار میں اور عملی زندگی میں ہندو اور مسلمان میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔ دونوں فرقوں کے ظلم سے، ناانصافی سے، میں مساوی طور پر شرمندہ ہوتا ہوں، افسردہ ہوتا

---

[1]۔ پندرہ روزہ "ویسٹ بنگال" ربندر ناتھ نمبر ۹ رمئی ۱۹۸۶ء۔ آن نداشنکر رائے کا مضمون دیکھئے۔ [2]۔ مضمون "مکتب مدرسے کی بنگلہ زبان" از، ربندر ناتھ ٹھاکر۔ ماہنامہ "پرباسی" بیساکھ ۱۳۴۱ مطابق ۱۹۳۴ء ص ۱۰۳۔

ہوتا ہوں، اور مجھے غصہ آتا ہے۔ ہندو مسلمان میں کسی طرح کی فرقہ پرستی
کو میں پورے ملک کے لئے باعث شرم سمجھتا ہوں۔"

انیسویں صدی کے آخر میں ہندستانی سیاست میں جو نیا موڑ آیا اس میں "ہندستانی قومیت" کا سوال اُبھر کر سامنے آیا اور ان ہی دلوں سے ربیندر ناتھ قومیت، ہندستانی ہندستانیوں میں اتحاد اور سوراج جیسے موضوعات پر غور و فکر کرنے لگے Boycott کی تحریک کے دنوں یہ دیکھا گیا کہ ہندوؤں نے اس تحریک میں جس قدر کھل کر حصہ لیا۔ مجموعی طور پر مسلمان اس سے دور رہے ہیں۔ ان دنوں مشرقی بنگال میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا۔ یہ تو صاف ہے کہ انگریزوں نے کھل کر پھوٹ ڈالنے میں حصہ لیا تھا چونکہ ان کی پالیسی ہی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" رہی ہے۔ انگریزوں نے مشرقی بنگال کے فساد کی وجہ یہ بتائی اور یہی پرچار کیا کہ بائی کاٹ کے نام پر ہندو لوگ غیر ملکی سستا سامان خریدنے سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں۔ اور غریب مسلمانوں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ غیر ملکی سامان کے بدلے قیمتی دیسی سامان خریدیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی بنگال میں کپڑا بننے والے بیشتر مسلمان تھے اور سودیشی تحریک سے خاص کر ان مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ بائیکاٹ تو محض ایک بہانہ تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کا ایک رئیس طبقہ (نوابان ڈھاکہ وغیرہ) انگریزوں سے مل گیا تھا اور وہ غریب مسلمانوں کو دنگا فساد میں لگائے ہوئے تھے۔

انگریزوں نے ہندستان کی حکومت دراصل مسلمانوں سے چھینی تھی یعنی انگریزوں سے قبل یہاں کا حاکم طبقہ مسلمان تھا اور اس پس منظر میں انگریزوں کے دشمنِ اوّل مسلمان تھے۔ کمپنی کے عہد ہی سے انگریزوں نے ہندوؤں سے تعلقات بڑھائے اور ہندو انگریز سے قریب ہوئے۔ ہندوؤں نے انگریزی تعلیم پائی! اس طرح انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں ہندو (اور خاص کر بنگالی ہندو چونکہ کلکتہ انگریزوں کا صدر مقام رہا) مغربی تعلیم (انگریزی) حاصل کر کے آگے بڑھے لیکن جب ہندوؤں میں مغربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ایسا طبقہ اُبھرا جس میں کچھ سیاسی شعور پیدا ہوا تھا اور جو انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اونچی سرکاری ملازمت وغیرہ کے خواہاں ہوئے اور حاکم انگریزوں کے ساتھ بیٹھنے کا خواب

دیکھنے لگے۔ تب انگریزوں نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوؤں کی پیش قدمی میں رکاوٹیں ڈالی جائیں اور اپنی پالیسی کے تحت اسی موڑ پر وہ مسلمانوں کی طرفداری کرنے لگے تاکہ ان میں بھی ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جو انگریزی تعلیم حاصل کر کے ہندوؤں کے مقابلہ میں آسکے۔ اس طرح انگریزوں نے بھی اس کی مدد اور کبھی اس کی مدد کرنے کی پالیسی اپنائی۔ اور دونوں میں نفرت اور پھوٹ کے جذبات کو بھڑکایا۔ تاریخ ہند کے اس موڑ پر مسلمان جو انگریزی تعلیم میں کافی پیچھے تھے ان میں سے چند مسلم رہنما ابھرے جن میں سرسید احمد خاں، منشی کرامت علی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی کوشش کی۔ اس تحریک میں مسلمانوں کا اہم ترین رہنما ہونے کا شرف سرسید احمد خاں کو حاصل ہے۔ لہٰذا سرسید احمد خاں کو انگریزی تعلیم یافتہ جدید ہندستانی مسلمانوں کی سوسائٹی کا بانی قرار دینا مناسب نہیں ہے وہی مسلمانوں میں پہلے رہنما ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکنے کی پوری کوشش کی اور اس سلسلے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے وہ صرف کانگریس مخالف ہی نہیں تھے بلکہ وہ اس امر کو سمجھ گئے تھے کہ اگر مسلمانوں کی ترقی کے لئے میدان صاف کرنا ہو تو انگریزوں کی مخالفت نہیں بلکہ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں سے محبت کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ ایسا جذبہ جس سے انگریز مسلمانوں کو اپنائے صرف اس طرح مسلمانوں کی موجودہ معاشی حالت میں سدھار ممکن ہے اور مسلمان بھی سرکاری ملازمت پاسکتے ہیں۔ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر بھی سرسید احمد خاں نے یہی کوشش کی کہ انگریز جو مسلمانوں سے بدظن ہو چکے ہیں اور مسلمانوں پر ان کا جو اعتماد اٹھ گیا ہے اس کو دور کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے یہ کتاب لکھ کر صرف چند جلدیں اپنے پاس رکھ لی تھیں اور باقی تمام جلدوں کو برطانوی حکومت کے خارجہ سکریٹری کو لندن بھیج دیا تھا۔[۱] انگریزوں کی تعریف کرنے کو سرسید احمد خاں نے ایک "سیاسی مصلحت" کے طور پر اپنایا تھا۔ لیکن انگریز "مصلحت" کے کھیل

---

[۱] "اسباب بغاوت ہند"، مرتب ڈاکٹر فوق کریمی۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد، دہلی ایڈیشن نومبر ۱۹۵۸ء ص ۱۱

میں زمانہ سے بہت آگے تھے! انہوں نے سرسید احمد خاں کو "دیا" کم اور "لیا" بہت زیادہ اور اس طرح چند مسلمانوں کو آگے بڑھانے کے نام پر اپنی سامراجیت کو وہ مضبوط بنا سکے اور دیرپا حکومت کر سکے اور اس طرح وہ انگریز مخالف جذبہ اور قومی آزادی کی جدوجہد سے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصہ کو دور رکھنے میں کامیاب ہوئے! انگریز اس سیاسی چال سے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے اور ان کو ایک دوسرے کا مخالف بنانے میں کامیاب ہوئے۔

مذکورہ باتوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کانگریس سے سب مسلمان ہی دور ہٹ گئے تھے۔ مسلمان رہنماؤں میں ایسے بھی کئی نام ہیں جو ہمیشہ سے کانگریس میں رہے ہیں مثلاً بنگال میں لیاقت حسین اور بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت کانگریس سے دور رہی اور مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی جماعت آغا خاں کی رہنمائی میں مسلم لیگ کے نام سے سنہ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کے نام پر کانگریس کی مخالفت کرنا اور انگریزوں سے سہولتیں حاصل کرنا ہی مسلم لیگی لیڈروں کا کام تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ رجعت پسند مسلم لیڈروں نے مسلم عوام میں مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارا۔ حالانکہ یہاں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں میں ایسے جذبات کو ہوا دینے میں ہندو فرقہ پرست طاقتوں نے بھی حصہ لیا ہے چونکہ "ہندوؤں کی بیداری" کے نام پر ہندو رجعت پسند قوتیں میدان میں اتر چکی تھیں اور یہ بھی بہت بڑی حد تک درست ہے کہ ہندستانی تہذیب پر اسلامی اثرات کو بھی ہندو رجعت پسند قوتیں اور کئی ہندو رہنما اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جب سماج کی یہ حالت ہو تو کوئی باشعور فنکار کیوں کر خاموش رہ سکتا ہے؟ رابندر ناتھ ٹھاکر بھی خاموش نہیں رہ سکے۔ ان کا قلم چلنے لگا اور وہ ان مسائل پر کھل کر لکھنے لگے۔ ان کے مشہور مضمون "ہندو مسلمان" میں انہوں نے ہندو مسلم اختلافات، بائی کاٹ اور سودیشی تحریک کی ناکامی کے وجوہات پر کھل کر روشنی ڈالی۔ انہوں نے لکھا ہے[1]

"آج ہم سب یہ کہہ کر افسوس کر رہے ہیں کہ انگریز پوشیدہ طور پر

---

[1] ماہنامہ "پرباسی" ماہ آشن ۱۳۱۴ مطابق سنہ ۱۹۰۷ء۔

مسلمانوں کا ساتھ دے رہا ہے اور ان کو ہندوؤں کے خلاف ابھار رہا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو انگریزوں پر غصہ کیوں کریں؟

سوچئے، کا مسئلہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کس نے ایسا استعمال کیا ہے وہ مسئلہ اہم نہیں ہے..... ہم میں جہاں کمزوری ہے اس سے تو دشمن فائدہ اٹھائے گا ہی...... اب ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے یعنی ہم محض جُدا جُدا نہیں ہیں بلکہ ہم میں کافی بھید بھاؤ ہے...... ہم سینکڑوں سال سے ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ ایک کھیت میں فصل اُگا کر، ایک ندی کا پانی اور ایک آفتاب کی روشنی سے مستفید ہوئے ہیں۔ ہم ایک ہی زبان میں بات چیت کرتے ہیں (یاد رہے کہ بنگالی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مادری زبان بنگلہ ہی ہے) ہم ایک ہی طرح کے دکھ سکھ پاتے ہوئے پروان چڑھے! اس کے باوجود پڑوسی سے پڑوسی کا جو رشتہ، انسانی رشتہ ہونا چاہیئے وہ ہم میں نہیں ہے...... ہم جانتے ہیں کہ بنگال کے کئی مقامات پر ہندو مسلمان ایک فرش پر نہیں بیٹھتے ہیں۔ گھر میں مسلمان آنے سے ان کے بیٹھنے کا انتظام الگ کیا جاتا ہے، حقّے کا پانی پھینک دیا جاتا ہے (یہاں یہ خیال رہے کہ ٹھاکر کے دور میں بنگال میں حقّہ پینا عام تھا، خاص کر دیہی بنگال کے گھر گھر میں لوگ حقّہ پیتے تھے اور ہندوؤں کے گھروں میں عموماً مسلمانوں کے لیے الگ حقّے ہی رکھے جاتے تھے.. مترجم)...... اگر یہی شاستر کا قانون ہو، یہی اُصول ہو، تب اس شاستر کو لے کر، ان اصولوں پر چل کر کبھی سودیشی یا سوراج قائم نہیں ہو سکتا۔"

اور ہندو سماج کی برائیاں بیان کی ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرستی کے خلاف انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ انہوں نے ہندوؤں پر الزام لگایا کہ ان کی تنگ نظری اور غیر اخلاقی برتاؤ سے عام مسلمان ہندوؤں سے دور ہو گئے ہیں اور ان کے دلوں میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رویندر ناتھ کہتے ہیں کہ کل ہند پیمانے پر ہندو تعداد میں زیادہ ہیں یعنی ہندوؤں کی اکثریت ہے لہذا اگر ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہیں تو ہندو بڑے بھائی ہوئے اور بڑوں پر یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ چھوٹوں کو اپنائیں۔ اور جب بڑے چھوٹوں کے قریب جائیں گے اور انہیں گلے لگائیں گے تو چھوٹے آخر کب تک دور رہ سکیں گے؟ ٹھاکر نے اس مضمون میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے زور دے کر یہی کہا کہ اس کام کو بھی دیہاتوں سے شروع کرنا ہوگا۔ چونکہ اصل ہندوستان دیہاتوں میں ہے اور ہندو مسلم اتحاد کو دراصل گاؤں گاؤں میں شروع کرنا چاہیئے، تب ہی یہ اتحاد پائیدار ہوگا۔ چونکہ کام کا میدان وہ میدان ہے جہاں ایک کو دوسرے کے قریب آنا پڑے گا اور اس طرح ان کے بھید بھاؤ رفتہ رفتہ مٹ جائیں گے۔ ورنہ اوپری سطح میں بنیادی اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی مضمون میں ٹھاکر نے یہ بھی لکھا کہ :-

> "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وقتی طور پر کام نکالنے کے لئے اپنے مطالبات کو کم کرکے ایک سمجھوتا کیا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی اصل بات باقی رہ جائے گی۔ سیاسی معاملات میں باہر سے جو لیپا پوتی ہو سکتی ہے، جوڑ توڑ کی جا سکتی ہے اور اس طرح سے جو میل ہو سکتا ہے، اس میل سے ہمیشہ کی ضرورت پوری نہیں ہوگی، ایسی کوئی امید نہیں ہے کہ سیاسی رفوگری ہمیشہ قائم رہے گی۔ رفو کی گئی جگہ پر بار بار زور پڑے گا...... جہاں جڑ میں خرابی ہو وہاں درخت کے سرے پر، اونچی شاخوں اور پتوں پر پانی ڈالنے سے فائدہ؟ ایسے عمل سے درخت کو ہمیشہ تر و تازہ رکھنا ناممکن ہے۔"

اگر گاؤں کے کام میں اتحاد ہو سکے تو ہندو مسلمان دونوں میں بنیادی طور پر

ملن پیدا ہوگا۔ اس کو عملی شکل دینے کی ٹھاکر نے ہمیشہ کوشش کی اور انہوں نے اس میدان میں کئی کامیابی کی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

(۱)

"کئی بار (مثلاً تہوار، شادی بیاہ، خوشی اور غم کے موقع پر) یا کبھی کبھی یوں ہی ہم میں میل ملاپ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم ساتھ ساتھ چلیں، قریب قریب رہیں، تب دیکھ پائیں گے کہ بطور انسان، انسان کو جاننا آسان ہے ــــ شانتی نکیتن میں کبھی کبھی مسلمان طلبا اور اساتذہ آئے، ان میں ہم نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا اور محبت میل و ملاپ میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جن سب گاؤں سے شانتی نکیتن کا تعلق ہے ان میں مسلمانوں کے گاؤں بھی ہیں۔ جب کلکتے سے ہندو مسلم فساد کی خبریں کلکتہ سے باہر پھیل گئیں تب بولپور (جہاں شانتی نکیتن ہے) کے علاقے میں یہ جھوٹی خبر پھیلائی گئی کہ ہندوؤں نے مسجدوں کو توڑنے کا فیصلہ کیا ہے، اور ساتھ ہی کلکتہ سے غنڈے بھیجے گئے۔ لیکن مقامی مسلمانوں کو پُر امن رکھنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس لئے کہ اُن کو بھروسا تھا کہ ہم ان کے حقیقی دوست ہیں۔"

(۲)

"میری زمینداری میں زیادہ تر مسلمان ہیں۔ جن دنوں قربانی کے سلسلے میں ملک بھر میں گرماگرمی تھی ان دنوں میری ہندو رعیت نے مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں اپنے علاقے میں قربانی نہ ہونے دوں۔ میں نے ان

کی درخواست رد کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کو بلا بھیجا اور ان سے کہا کہ قربانی کا فرض اس طرح ادا کریں جس سے ہندوؤں کے دلوں میں ٹھیس نہ لگے۔ وہ لوگ مان گئے اور انہوں نے ایسا ہی انتظام کیا۔ لہذا ہمارے یہاں ابھی تک کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ مجھے یہ کامل یقین ہے کہ یہاں ایسا کبھی نہیں ہوگا چونکہ میرے تعلقات مسلمانوں سے نہایت دوستانہ اور خوش گوار ہیں۔"

"مسلمان ہمارے بالکل اپنے ہیں۔ اس حقیقت کو کسی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ ایک دن میری ایک مسلمان راعی نے مجھے بلا وجہ ایک روپیہ سلامی دی۔ میں نے کہا کہ میں نے تو تم سے کچھ نہیں مانگا۔ اس پر وہ بولا "میں نہ دوں تو تم کیا کھاؤ گے ـــــ بات سچ ہے مسلمان رعیت کا دیا ہوا ہی تو لتے زمانے سے کھاتا آیا ہوں (مشرقی بنگال میں زیادہ تر کسان بنگالی مسلمان ہیں)۔ ان کو دل سے چاہتا ہوں وہ چاہنے کے لائق ہیں۔ لیکن اگر آج اچانک وہ مجھے مارے، مجھ پر حملہ کرے، تب نہایت دکھ میں مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ کس ہنگامی جذبے سے اس کی عقل ماری گئی ہے چونکہ یہ کبھی اس کی فطرت نہیں رہی ہے۔ اگر وقت مشکل اس طرح سوچ سکوں، غور وفکر کر سکوں، تب ہی میں عقل کی اس خرابی کی وجہ پا سکوں گا۔ لیکن اگر میں بھی غصہ سے بے قابو ہو جاؤں اور اس کا ہتھیار چھین کر اس پر وار کروں تب یہ "عقل کی خرابی" اس میں جڑ پکڑ لے گی اور نتیجتاً تباہی اور بربادی آئے گی۔"[1]

---

[1] ماہنامہ "پرباسی" ماہ آشن، بنگلہ سن ۱۳۳۸ - مطابق ۱۹۳۱ء صـ ۸۵۵

مضمون "ہندو و شوا و دیالیہ" میں ٹھاکر نے یہی کہا کہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں اہم رکاوٹ ہے۔ ربندر ناتھ کے اس خیال کی بھرپور تائید کرتے ہوئے ویجندر لال ناتھ لکھتے ہیں [۱]

"ربندر ناتھ کے خیال سے ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی رجعت پسندانہ ہندوپن نے مسلمانوں میں فرقہ وارانہ جذبات کو بڑھایا ہے جس کے نتیجہ میں قانونی طور پر مسلمانوں کا مذہبی تحفظ، مسلم حقوق کی مانگ، روز بروز بڑھتی گئی۔ ربندر ناتھ کا خیال ہے کہ مسلمان جو قانونی طور پر زیادہ حقوق طلب کر رہے ہیں اس کی طرفداری ہندوؤں کو کرنا چاہیے۔ کیونکہ تعلیم میں، تہذیب میں، سماجی غیر مساوات سے دو فرقوں میں ملاپ ممکن نہیں ہے۔ اگر سیاسی طور پر زیادہ حقوق اور سہولیتیں پا کر مسلمان سماج میں ترقی کر پائیں اور ہندوؤں کی برابری کر سکیں، تب ہندو مسلم اتحاد قوی ہوگا اور دوستی کی بنیاد مضبوط ہوگی۔ اور وہ اتحاد دیرپا ہوگا۔ فرقہ وارانہ مسئلے کا حل کے طور پر ربندر ناتھ نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۱۱ء میں یعنی تقسیم ہند کے ۳۶ برس پہلے کیا تھا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس عہد کے رسم و رواج میں جکڑے ہوئے لوگ، تنگ نظر سیاسی رہنما، ربندر ناتھ کی دور اندیشی اور مستقبل پر ان کی گہری نظر اور فرقہ وارانہ اتحاد کے اس دلی جذبہ اور کوشش کو تسلیم کر کے اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکے نتیجتہً نہ چاہتے ہوئے بھی، ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے لئے الگ آزاد ملک کا حق تسلیم کرتے ہوئے تقسیم شدہ ہند کی آزادی کو انہیں قبول کرنا پڑا۔"

ربندر ناتھ اس سے آگاہ تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں چند بنیادی اختلافات

---

[۱] ہفتہ وار "پچھم بنگا" (بنگلہ زبان میں) ربندر ناتھ نمبر۔ ۸ مئی ۱۹۸۰ء صہ ۹۲۷

ہیں اس کے باوجود وہ سیاسی اور قومی زندگی میں دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں اتحاد کے خواہاں تھے۔ انہوں نے صاف الفاظ میں یہ تسلیم کیا کہ صدیوں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک ملک میں رہنے کی بنا پر ایک مشترکہ تہذیب پیدا ہوئی ہے اور موجودہ ہندستانی تہذیب کی تعمیر میں مسلمانوں کا عظیم حصہ ہے انہوں نے بتایا کہ رہن سہن، لباس، صنعت، فنون، ادب، موسیقی اور جدید ہندستانی زبانوں کی تعمیر کے میدان میں ہم نے ایک دوسرے کا کافی اثر قبول کیا ہے اور اس سلسلے میں کس نے کیا دیا کس کا کتنا حصہ ہے اس کا فیصلہ کرنا بھی آج مشکل ہے۔ لہٰذا وہ اتحاد کا ایک پل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔

بہرحال سیاست کے ہنگامی دنوں میں جب ہندو مسلم سوال ابھرا تو ٹھاکر نے اس کا واحد حل یہی بتایا تھا کہ گاؤں کی طرف لوٹ چلو اور گاؤں سے کام کی ابتدا کرو لیکن کسی نے ان کی آواز پر لبیک نہیں کہا۔ سیاسی اختلافات اور بحث و تکرار سے ٹھاکر متاثر نہیں ہوئے چونکہ ان کا خیال یہی تھا کہ مٹھی بھر دانشوروں کی وجہ سے سوراج مل نہیں سکتا جب تک عملی میدان میں گاؤں گاؤں میں، کسانوں کے گھر گھر میں نئی بیداری کی روح نہ پھونکی جائے تب تک ترقی ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے خوب محسوس کیا تھا کہ بائی کاٹ تحریک یا سودیشی تحریک گاؤں کے کسانوں میں کوئی ہل چل پیدا نہیں کر سکی ہے۔ بائی کاٹ تحریک کے دنوں جب شہر کے چند بابو لوگ گاؤں میں کسانوں کی طرف متوجہ ہوئے اور سیاسی رہنما گاؤں میں جا کر تقاریر کرنے لگے، تب انہوں نے ایسے سیاسی رہنماؤں کے سلسلے میں صاف اعلان کیا کہ اس سے گاؤں والے متوجہ نہیں ہوں گے۔ چونکہ کسانوں کو اپنانے کے لئے، کسانوں سے میل ملاپ رکھنا ضروری ہے۔ گاؤں سے تعلقات بڑھانے ہی کو رابندر ناتھ نے فرقہ پرستی کا حل اور سوراج یا آزادی کا پہلا قدم قرار دیا۔ اور بتایا کہ یہیں سے ہندو مسلم اتحاد کی بنیادوں کو پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔ کاش کوئی ایسا کرتا، اور گاؤں گاؤں میں ہندو مسلم اتحاد قائم ہو جاتا۔ بہرحال ٹھاکر خوش نصیب تھے کہ ان کو تقسیم ملک دیکھنا نہیں پڑا۔ اور وہ اس امید کو اپنے ساتھ لے جا سکے کہ کوئی ان کی آواز پر لبیک کہے گا اور فرقہ پرستی کی جڑ کو کاٹ دے گا۔

میرا خیال ہے کہ اگر تحریک پاکستان کے دوران اور تقسیم ملک کے وقت تک
اگر ٹھاکر زندہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ ملک تقسیم نہیں ہوتا، کیونکہ کم از کم بنگال میں
رابندرناتھ ٹھاکر کی آواز ہندوستان کے تمام دیگر ہندو مسلمان لیڈروں کے مقابلے
میں زیادہ وزن رکھتی تھی۔

"Uttarayan"
Santiniketan, Bengal
19/11/33

Cities are organic expressions of culture.
Until today our cities have grown up,
as much of our exterior life has, chaotically.
They have been imitation of Europe and their
lives have flowed in channels which have
been sometimes at tangent, sometimes
parallel to our own. Now that India is
slowly coming to her own our towns should
mirror our national culture and artistic
sensibility. I look forward to a Calcutta
which will reflect this ideal.

Rabindranath Tagore

ٹیگور روس میں ——— ۱۹۳۰ء
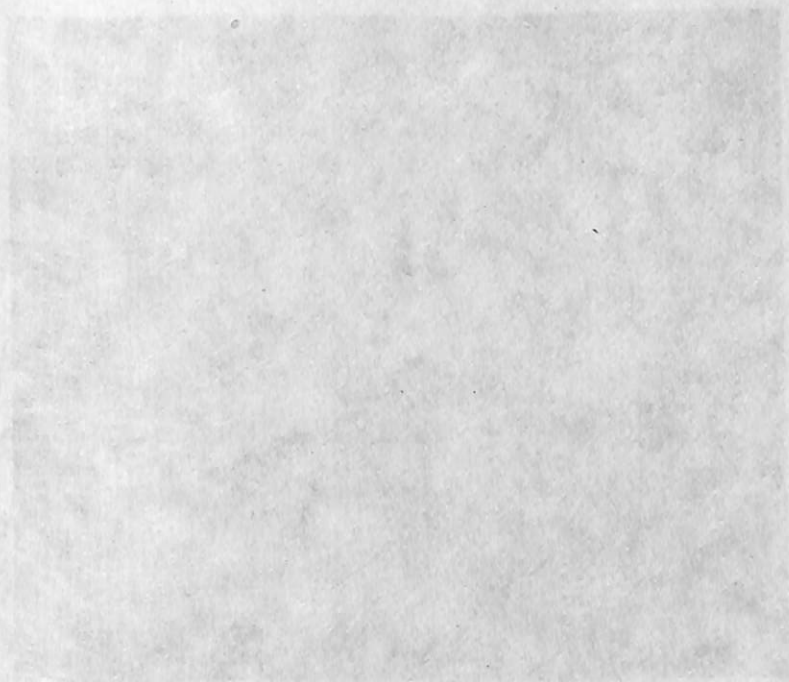
روس کے خطوط

"روس کے خطوط" سے چند اقتباسات پچھلے صفحات میں بھی دیئے گئے ہیں اور ٹھاکر کے سفرِ روس کا کہیں کہیں ذکر بھی آیا ہے۔ اگلے صفحات میں بھی روس کے سفر کا ذکر آسکتا ہے۔ لیکن یہاں ہم ٹھاکر کے دورۂ روس اور اس سلسلے میں ان کی تصنیف "روس کے خطوط" کا خاص کر ذکر کریں گے! اس لئے کہ عہدِ ٹھاکر میں روس ہی واحد اشتراکی ملک تھا اور وہ بھی ایک ایسا زمانہ جب وہاں انقلاب کے بعد نئے سوشلسٹ سماج کی طرف تعمیر ہو رہی تھی۔ مخدوم محی الدین نے ربندرناتھ کے سفرِ روس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔[1]

"۱۹۲۶ء میں روس سے بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ یہ وہاں گئے، اور نوجوانانِ روس کی تعلیمی حالات کا مطالعہ کیا۔"

مخدوم کا یہ بیان غلط ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ٹھاکر روس نہیں گئے تھے۔ حقیقت یوں ہے کہ ۱۹۲۶ء میں شاعر نے سفرِ روس کی تیاری کرلی تھی لیکن وہ بیمار پڑ گئے، اور جا نہیں سکے۔ پھر ۱۹۳۰ء میں وہ سوویت روس کے سفر پر گئے۔

اکتوبر انقلاب (۱۹۱۷ء) یا روسی انقلاب، تاریخ عالم کا وہ عظیم واقعہ جس سے تمام دنیا کی آنکھیں کھل گئیں اور دنیا بھر کے دانشوروں کی نظریں روس پر جم گئیں۔ ربندرناتھ کمیونسٹ نہیں تھے لیکن ایک حق پرست باشعور دانشور تھے۔ لہذا وہ اکتوبر انقلاب سے متاثر ہوئے۔

---

[1] ٹیگور اور ان کی شاعری۔ مخدوم محی الدین، مطبع عہد آفریں، حیدرآباد ۱۹۳۵ء

حالانکہ دنیا کے بیشتر دانشوروں کی طرح ان کے دل میں بھی سینکڑوں اندیشے تھے۔ اکتوبر انقلاب کے صرف آٹھ ماہ بعد ٹھاکر نے رسالہ "موڈرن ریویو" میں انقلاب روس کا ذکر مضمون ——— "At The cross roads" میں کیا۔ اور جب کہ پوری دنیا میں روسی انقلاب کے خلاف بے شمار مضامین لکھے جا رہے تھے۔ ان دنوں ٹھاکر نے کہا کہ ہمارے سامنے انقلاب روس کے سلسلے میں جو کچھ مواد ہے اس کی بنیاد پر کوئی واضح تصویر سامنے نہیں آتی ہے اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ انقلاب ناکام ہوگا لیکن نئے افق پر جو ستارہ ابھرا ہے اگر وہ ڈوب بھی جائے تب بھی یہ ستارہ اس کا اعلان نامہ ضرور ہے کہ نیا سویرا ہونے کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ربندر ناتھ اپنی آنکھوں سے اس ملک کو دیکھنا چاہتے تھے جہاں کے افق پر وہ نیا ستارہ ابھرا تھا۔ اسی لئے انہوں نے دو ہفتہ تک روس کا دورہ کیا اور سب کچھ گھوم پھر کر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے اس سفر روس کو انہوں نے بڑے فخر اور مکمل اعتماد سے "تیرتھ درشن" قرار دیا۔ سوویت روس میں ان دنوں نہایت تیزی سے اشتراکی سماج کی تعمیر ہو رہی تھی۔ دورۂ روس سے پہلے اشتراکی نظام کی کوئی واضح تصویر ٹھاکر کے ذہن میں تھی۔ روس جا کر انہوں نے دیکھا کہ تعلیم اور عوام کے معاشی حالت کو سدھارنے کے سلسلے میں وہ عمر بھر جو خواب دیکھتے رہے ہیں، اس پر عمل روس میں ہو رہا ہے لہذا "روس کے خطوط" میں انہوں نے آنکھوں دیکھا حال لکھا اور اپنے اس سفر کو "تیرتھ درشن" قرار دیکر بعد کی پوری زندگی میں اس "تیرتھ" کی حفاظت کرتے اور اس "تیرتھ" کے خلاف سامراجیوں کی تمام سازشوں کا پردہ چاک کرتے اور روس کو مٹانے کے لئے سامراجیوں کے جنگی منصوبوں سے عوام کو ہوشیار کرنے میں صرف کیا۔ چونکہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ روسی انقلاب نے انسانیت کی بقا کے دروازوں کو کھول دیا ہے "روس کے خطوط" میں انہوں نے لکھا۔

"یاد رکھو، یہاں جس انقلاب سے زار روس کی شکست ہوئی ہے وہ صرف ۱۹۱۷ء کی بات ہے یعنی صرف ۱۳ برس ہوئے ہیں۔ اس دوران ان لوگوں کو ہر طرح کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ گھر کے اور باہر کے دشمنوں کا۔ ان کے پاس کوئی دھن دولت نہیں ہے۔ غیر ملکی مہاجن (سرمایہ دار)

سے ان کو کوئی قرض نہیں مل سکتا۔ ملک میں بیشتر ضروری کل کارخانے
نہ ہونے کی وجہ سے وہ کمزور ہیں اور میدان پیداوار میں پیچھے ہیں کسی طرح
پیٹ پال کر وہ لوگ ملک کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں اس کے باوجود، کسی ملک
کے لئے جو سب سے زیادہ غیر ضروری خرچ کا محکمہ ہے یعنی فوجی خرچ، اس کو مکمل
طور پر تیار رکھنے کا بھاری بھرکم فضول خرچ کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہیں کیونکہ
جدید مہاجنی (سرمایہ دارانہ) دور میں تمام سیاسی طاقتیں ان کی دشمن ہیں
اور ان سرمایہ دار ملکوں کے ہتھیار گھر ہتھیاروں سے بھرے پڑے ہیں۔"

سفر روس کے دوران انہوں نے تعلیمی اداروں کو دیکھا، کسانوں، مزدوروں سے ملے
بچوں سے ہنسے کھیلے اور ساتھ ہی وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں کی محفلوں میں شریک ہوئے
ماسکو سے روانگی کے وقت انہوں نے صحافیوں سے دورۂ روس کے سلسلے میں کہا:

"تم لوگوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ عظیم ہے اس لئے اس کی
عظمت کی حفاظت کرو۔ تمہارا یہ کام صرف تمہارے ملک کے لئے نہیں ہے بلکہ
پوری انسانیت کے لئے ہے ----- تم لوگوں پر پوری انسانیت کی بھلائی
کی ذمہ داری ہے۔ دشمن بھی آخر انسان ہی ہیں۔ ان سے نفرت کیوں کروگے؟
تمہارے نیک ارادے ان پر یقیناً اثر انداز ہوں گے اور ان کو دوست بنالیں
گے ----- تم لوگوں کا نظریہ عظیم ہے اور اسی لئے تم لوگوں سے کہے جا رہا ہوں
کہ آزادی کے وسیع میدان میں اس کی بنیاد ڈال کر اسے کامیاب کرو۔"

دورہ روس سے پہلے ربندر ناتھ بارہا دنیا کے ان ممالک کا سفر کر چکے تھے جو ترقی یافتہ
ممالک کہے جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکا کے سلسلے میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے ان تصانیف
کے مطالعہ سے یہ صاف ہے کہ وہاں کے سماج میں ان کو کئی برائیاں بھی نظر آئی ہیں جن کا انہوں نے

۱؎ "روس کے خطوط" (بنگلہ) خط نمبر ۴۔ خط کی تاریخ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۰ء

۲؎ وشو اسبھائے ربندر ناتھ۔ از موہت میا دیوی۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۰ء ص ۲۵۵

کھل کر اظہار کیا ہے اور مخالفت کی ہے لیکن "روس کے خطوط" کو بار بار پڑھنے پر بھی ایسی کوئی بات پائی نہیں جاتی جس کی ٹھاکر نے مخالفت کی ہو۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روسی عوام کی کوششوں سے وہ خوش ہوئے تھے اور وہ انسانیت کے بھلائی کے لئے جو کچھ کر رہے تھے نہ صرف اس سے متاثر ہوئے تھے بلکہ ان کو یہ محسوس ہوا تھا کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے"۔

نامور ترقی پسند ادیب منوج بسو نے ٹھاکر کے دورۂ روس کے سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روسی عوام نے شاعر سے کتنی دلچسپی لی۔ منوج بسو[۱] ۱۹۵۰ء میں روس گئے تھے۔ ماسکو شہر کے یونین آف رائٹرس (انجمن مصنفین) کے ایک جلسہ کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے[۲]:-

"ایک صاحب نے ربندر ناتھ کا ذکر چھیڑا ـــــ ربندر ناتھ جب روس گئے تھے تب تک انقلاب کے آثار مٹے نہیں تھے۔ کئی دشواریاں تھیں کھانے پینے کی چیزیں ٹھیک ملتی نہیں تھیں۔ ربندر ناتھ کے رہنے کا انتظام شہر سے دور ایک مکان میں کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ وہاں آرام سے رہ سکیں ـــــ وہ بوڑھا کہنے لگا ـــــ انقلاب سے پہلے بھی ہمارے ملک میں ان کی نظموں کا ترجمہ ہوا تھا۔ ہم ان کے نام سے آگاہ تھے کچھ کچھ پڑھا بھی تھا، ہم نے۔ ایک دن کی بات یاد ہے۔ ہم کوئی پندرہ آدمی ایک ساتھ بیٹھے تھے ـــــ بار بار ہم نے ان کو دیکھا، لیکن دیکھ دیکھ کر تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگا جیسے کوئی پیغمبر ہوں۔ ان کا نورانی چہرہ، آنکھیں، داڑھی، لباس، سب کچھ ملا کر حسن کا ایک بے مثال نمونہ۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ آواز جیسے موسیقی۔ دو گھنٹہ

۱۔ منوج بسو کا انتقال دسمبر ۱۹۸۷ء میں ہوا۔

۲۔ ربندر ناتھ سمرتی۔ مرتب وشوا ناتھ دے۔ ص ۳۰۲

تک باتیں کرتے رہے۔ ہم ڈر گئے کہ شاید وہ تھک جائیں۔ کچھ نہیں ـــــ اُن دنوں ماسکو ایک بڑے گاؤں کی طرح تھا ـــــ اتنے بڑے ملک کا یہ پایہ تخت۔ لیکن ہم نا امید نہیں ہوئے ـــــ اتنے میں وہ مزے دار واقعہ پیش آیا ـــــ وہ بوڑھا کہتے کہتے ہنس پڑا ـــــ نہ معلوم کس طرح یہ بات پھیل گئی تھی کہ گرجا گھر کے ایک پادری کو ہم لوگوں نے اس مکان میں چھپا رکھا ہے۔ ٹھاکر کی داڑھی اور لباس دیکھ کر لوگوں نے ان کو پادری سمجھا تھا۔ انقلاب کی ہوائیں تب بھی چل رہی تھیں، لوگ پادری، پروہت پر خفا تھے۔ چونکہ یہ لوگ رئیسوں کے ساتھ سازش کر کے انقلاب کو ناکام بنانے اور پرانے دن پھر سے لوٹا لانے کے لئے کوشاں تھے۔ عوام نے ایک دن حملہ کر دیا۔ ہم لوگوں نے کہا۔ یہ پادری نہیں ہیں، بہت بڑے شاعر ہیں ہندستان سے آئے ہیں، اور ہمارے مہمان ہیں ـــــ تب عوام چلّانے لگے ـــــ "تو پھر ہمیں اچھی طرح دیکھنے دو ہے" ٹھاکر اوپر کے برآمدے میں آئے۔ وقت صبح، چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنی اور اس اُجالے میں وہ دلکش حسین چہرہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ سب لوگ نہایت خوش ہوئے اور ان کی جے جے پکارنے لگے ـــــ لیکن پھر ایک اور مصیبت شروع ہو گئی" ٹھاکر کو دیکھیں گے، ٹھاکر کو دیکھیں گے ـــــ شاعر برآمدے میں بار بار آتے اور لوگ ہجوم در ہجوم ان کا درشن کرتے اور خوش ہوتے ـــــ"

چن موہن سہانویش نے پتروبھ فائیڈوروچ (Petrove Fyodorovich) جو رابندر ناتھ کے دورہ روس کے دنوں روسی ثقافتی تعلقات کی تنظیم کے سربراہ تھے اور جن پر ٹھاکر کے دورے کی تمام ذمہ داریاں تھیں، سے ایک ملاقات کا حال لکھتے ہوئے لکھا کہ [۲]

---

[۱] دیکھئے سہانویش کا مضمون "بندرہ روزہ ویسٹ بنگال" (انگریزی) کے رابندر ناتھ نمبر ۱۹۸۶ء میں۔

[۲] چن موہن سہانویش کا انتقال ۱۹۸۶ء میں ہو گیا۔

ٹھاکر نے پڑوبھ سے بیان کیا تھا کہ ان کے بہت سارے دوستوں نے ان کو روس کا دورہ کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ سیہانوبیش کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پڑوبھ نے بتایا کہ "لینن" ربندرناتھ کو ادبی دنیا کا ایک ستارہ سمجھتے تھے۔ لینن نے ٹھاکر کی چند تصانیف کا مطالعہ کیا تھا اور ان کے کتب خانے میں ٹھاکر کی چند کتابیں تھیں۔ محترمہ کروپسکیا (Krupskaya) نے جو وزیر تعلیم تھیں، ٹھاکر کے درس و تدریس کی بابت تحریروں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنی تصنیف "عالمی نظام تعلیم" میں ٹھاکر کے نظریہ تعلیم کا تذکرہ کیا تھا۔ لینن نے اس کتاب کی ایک کاپی میکسم گورکی کو بھیج کر ان سے رائے طلب کی تھی اور گورکی نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ـــــ کروپسکیا اور لینن دونوں نے ٹھاکر کا یہ خیال کہ تعلیم کا گہرا لگاؤ "فطرت اور محنت" (Nature and Labour) سے ہونا چاہیے، کو کافی اہمیت دی تھی ـــ ٹھاکر سے لینن کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے پڑوبھ نے مجھے کریملن میں لینن کے ذاتی کتب خانہ دیکھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے بتایا کہ اس لائبریری میں ٹھاکر کی پانچ کتابیں ہیں۔ میں اس لائبریری میں گیا اور وہاں مجھے "گیتا نجلی، نیشنلزم، گھر اور دنیا اور باغبان ـــــ پانچویں کتاب کا نام مجھے یاد نہیں ـــ یہ کتابیں روسی یا جرمنی زبان میں ملیں۔"

سیہانوبیش نے ایک اور مضمون[1] میں لکھا کہ ۱۹۲۱ء میں لینن نے ایک ہندوستانی انقلابی عبدالرب پیشاوری سے کہا تھا کہ وہ ضروری کتابوں کی ایک ایسی فہرست تیار کردیں۔ جن کا مطالعہ کرنے سے ہندوستان کے حالات کا اندازہ لگایا جاسکے۔ ان دنوں ایم این رائے (M.N.ROY) بھی وہاں موجود تھے لیکن لینن نے یہ کام عبدالرب کے سپرد کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سلسلے میں عبدالرب کا مطالعہ نہایت گہرا تھا۔ عبدالرب نے ۳۷ کتابوں کی جو فہرست بنا کر لینن کو دی تھی اس میں ٹھاکر کی تصنیف "قومیت" (Nationalism) بھی تھی۔ یہ فہرست لینن کو پسند آئی اور انہوں نے فہرست پر "Excellent" (بہترین) لکھا جس کا مطلب تھا

---

[1] سہ ماہی بنگلہ رسالہ "اکیاتان" ربندرناتھ نمبر ۱۹۸۶ء ص ۶۳-۶۲

کہ یہ کتابیں فوراً حاصل کی جائیں پھر یہ کتابیں مختلف مقامات سے منگوائی گئیں۔ غالباً لینن کے کتب خانے میں Nationalism کی جو کاپی موجود ہے وہ اسی وقت کی ہے۔"

انقلاب روس نے کیا کام انجام دیا کہ سلسلے میں رابندر ناتھ نے لکھا ہے :۔

"کھجور اور تاڑ کے درخت قدرت کا تحفہ ہیں۔ لیکن تاڑی خانہ یا سیندھی خانہ انسان نے قائم کئے۔ تاڑ کے درخت کو کاٹ ڈالنے سے نشہ کی جڑ ختم نہیں ہوگی۔ نشہ کے زہریلے دانت اگر کہیں ہیں تو اس کی جڑ "لالچ" ہے، منافع خوری ہے۔ روس میں ایسے زہریلے دانت کو اکھاڑ پھینکا گیا ہے ـــــــ"

سوویت روس کا دورہ کرنے کے بعد وہاں سے رابندر ناتھ امریکا گئے تھے۔ وہاں امریکی صحافیوں نے ان پر سوالات کی بوچھار کردی اور بار بار یہ کوشش کی تھی کہ ٹھاکر روس کے خلاف کچھ نہ کچھ کہیں۔ کم از کم روس میں مذہب پر حملے کے سلسلے میں۔ لیکن ٹھاکر کے جوابات سن کر سرمایہ دارانہ پریس کے صحافی دنگ رہ گئے۔ انھوں نے نیویارک میں امریکی لوگوں سے کہا:۔[1]

"روس میں ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی ہے۔ ماسکو گیا، وہاں دیکھا کہ کسان اور مزدور جو تعلیم پا رہے ہیں اس سے وہ محض فیکٹریوں میں مزدوری کے لائق ہی نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ان کا ذہن بھی روشن ہو رہا ہے ـــــ وہاں کے عوام تہذیبی زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس سالوں میں روس میں جو عظیم تبدیلی آئی ہے، ہمارے ہاں، ہندوستان کے لوگوں کے یہاں، وہ حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے ـــــ روسی عوام عام مذہبی رسم و رواج پر یقین نہیں رکھتے بلکہ انسانیت کی خدمت ہی ان کا مذہب ہے ـــــ"

۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء بنگال کے کئی فنکاروں کی تصانیف کو برٹش حکومت نے ضبط کرلیا تھا لیکن ٹھاکر کی کسی کتاب کو ضبط کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ "روس کے خطوط"

---

[1] وشوا سبھائے رابندر ناتھ۔ از موتریا دیوی صـ ۶۵-۲۶۴

بنگلہ ماہنامہ "پرباسی" میں بنگلہ سنہ ۱۳۳۷ ۳۸ مطابق ۱۹۳۰ء میں قسط وار شائع ہوئے ان دنوں چند لوگوں کا خیال تھا کہ حکومت ان خطوط کی اشاعت پر پابندی لگائے گی اور رسالے "پرباسی" کے شمارے ضبط کر لئے جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بنگلہ زبان میں "روس کے خطوط" کتابی شکل میں بیساکھ ۱۳۳۸ مطابق مئی ۱۹۳۱ء منظر عام پر آئے لیکن پھر بھی برٹش حکومت نے اس پر پابندی نہیں لگائی۔ لیکن جب ڈاکٹر ششدھر سنہا نے اس کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا اور جون ۱۹۳۴ء میں انگریزی ماہنامہ "موڈرن ریویو" (Modren Revieus) میں پہلی قسط "On Russia" کے عنوان سے شائع ہوئی تو حکومت نے فوراً اس پر پابندی لگادی۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔؟

شری نیپال مجومدار نے اس پابندی لگانے کا تفصیلی ذکر کیا ہے مختصر طور پر ان کے مضمون سے یہاں چند باتیں پیش کرتا ہوں: "روس کے خطوط" میں ٹھاکر نے محض روسی اشتراکیت کے گن نہیں گائے بلکہ ہر ہر قدم پر انہوں نے روس کی ترقی کے ساتھ ہندستان کی بدحالی کا مقابلہ کیا اور اس طرح انگریز سامراجیوں کی ناانصافی کا پردہ چاک کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سامراجی طاقتیں کس طرح دنیا کے کونے کونے میں ظلم ڈھا رہی ہیں اس کا بھی ربندرناتھ نے واضح نقشہ کھینچا ہے اس طرح "روس کے خطوط" ایک طرف اشتراکی نظام کی کامیابی کا اعلان نامے تھے تو دوسری طرف وہ سامراجی لوٹ کھسوٹ کو دنیا کی نظروں میں بے نقاب کرتے تھے۔ لہذا دنیا کی ایک بلند علمی ادبی زبان اور خاص کر انگلستان کی انگریزی میں اس کا ترجمہ ہونا سامراجیوں کے لئے نہایت ہی خطرناک تھا۔ "روس کے خطوط" کے انگریزی ترجمہ پر پابندی کا سوال برٹش پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا گیا تھا کہ جب اصل بنگلہ تصنیف پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی تو اس کے انگریزی ترجمے پر ایسی پابندی کیوں لگائی گئی اور وہ بھی جب کہ اس کی صرف ایک ہی قسط ایک رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ برٹش پارلیمنٹ کے ایک رکن مسٹر آر جے ڈیوس (Mr. R. J. Davies) نے جب سوال اٹھایا تو برٹش حکومت ہند کی طرف سے مسٹر بٹلر (Mr. Batlar) نائب سکریٹری برائے ہند کو جواب دینا پڑا اور وہ جواب یوں تھا۔

بنگلہ ہفتہ وار "پچھم بنگہ" ربندرناتھ نمبر ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۰۶۲ تا ۱۰۶۴

"ایڈیٹر رسالہ "موڈرن ریویو" کو ربندر ناتھ ٹھاکر کا ایک مضمون شائع کرنے پر وارننگ (Warning) دی گئی۔ یہ مضمون "روس کے خطوط" نامی ایک بنگلہ کتاب سے لیا گیا۔ جسے ایک مقامی پریس نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔ بنگلہ زبان کی وہ تصنیف عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی لہذا حکومت نے اس کا کوئی نوٹس (Notice) نہیں لیا۔ اور اس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ لیکن اب اس کے ایک باب کا انگریزی ترجمہ ہوا ہے جو واضح طور پر..... ہندستان میں برٹش حکومت کی توہین ہے اور حکومت کو ذلیل اور بدنام کرتی ہے اور وہ بھی ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ میں۔"

"روس کے خطوط" کے انگریزی ترجمہ پر پابندی کے خلاف خود ٹھاکر نے کبھی کچھ نہیں کہا حالانکہ دیگر جس کسی مصنّف کی کوئی کتاب (مثلاً سرت چندر چٹرجی) پر حکومت نے پابندی لگائی تھی اس کے خلاف ٹھاکر نے آواز اٹھائی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا اور وہ خود اپنے سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں جب کل ہند ترقی پسند مصنّفین کی انجمن قائم ہوئی تو شہر پیریس میں جو عالمی امن کانفرنس ہوئی (۴ تا ۶ ستمبر ۱۹۳۶ء) اس کانفرنس میں ہندستان کے ترقی پسند مصنّفین کی طرف سے جن تصانیف پر پابندی اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا تھا اس میں ٹھاکر کی تصنیف "روس کے خطوط" کا نام بھی شامل ہے اور اس تجویز پر جن قلم کاروں نے دستخط کئے تھے ان ربندر ناتھ بھی رہے ہیں لیکن حکومت نے ان دنوں پابندی نہیں اٹھائی اور نہ ہی ربندر ناتھ کی زندگی میں ان کی اس تصنیف پر پابندی اٹھائی گئی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے لئے شرم کی بات تو یہ ہے کہ آزادی کے برسوں بعد بھی روس کے خطوط پر انگریزوں کی لگائی ہوئی پابندی برقرار رہی اور برسوں بعد جب ٹیگور ناتھ کا صد سالہ جشن منانے کے دن آئے تب ہماری آنکھیں کھلیں۔ آخر کار ۱۹۶۰ء میں یہ پابندی اٹھالی گئی اور وشوا بھارتی نے "روس کے خطوط" کا انگریزی ترجمہ "Letters from Russia" کے نام سے شائع کیا۔

ٹیگور برلن میں آئن اسٹائن کے ہمراہ ——— ۱۹۳۰ء
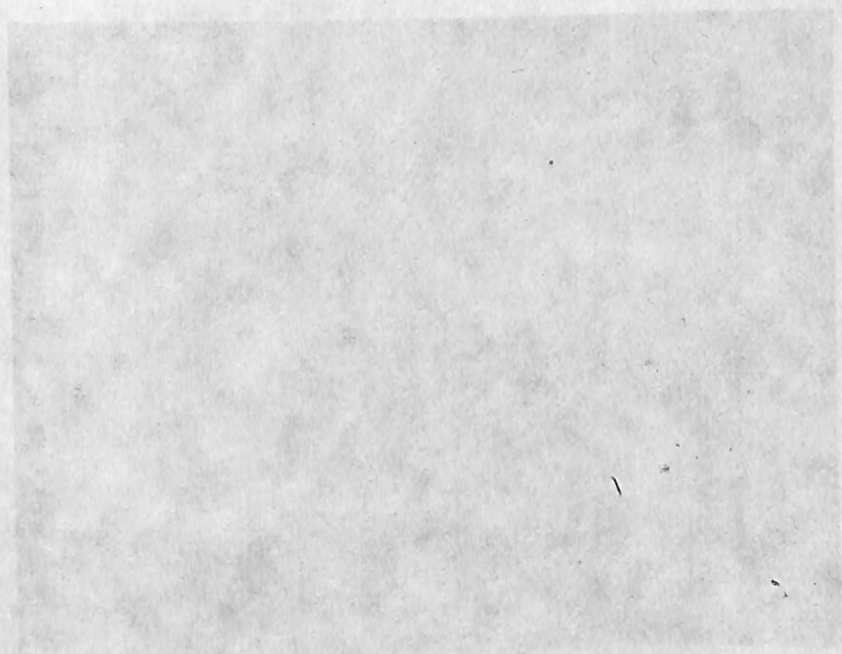
امن عالم کا ساتھی

سامراج اور فاشسٹ دشمن

رابندر ناتھ ٹھاکر

امن عالم کا ساتھی یا "امن کا پجاری" کہنے پر یہ نہ سمجھا جائے کہ رابندر ناتھ جنگ کے
خلاف تھے اور ہر حالت میں "امن" کے خواہاں۔ اگر ہم ایسا خیال کریں تو رابندر ناتھ کے ساتھ
بڑی ناانصافی ہوگی۔ رابندر ناتھ مذہبی طور پر برہمو سماجی تھے جس مذہب کی بنیاد "ستم، شیوم،
ادھوتم" پر ہے لیکن انہوں نے گاندھی جی طرح یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ "اہنسا" (تشدد) کے خلاف
ہیں یا یہ کہ وہ "اہنسا" کے پجاری ہیں۔ انہوں نے "اہنسا" کو "پرم دھرم" نہیں کہا۔ ان کو مذہب
امن کا پیرو" یعنی Pacifist قرار دینا ہی غلط ہوگا۔" جنگ کی ضرورت سے ٹھاکر آگاہ تھے
اگر جنگ انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو، تو وہ ایسی جنگ کے طرفدار تھے۔ روس
کے خطوط میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے لکھا کہ روس مجبور ہے فوجی خرچ کو پورا کرنے پر
حالانکہ وہ اس خرچ کو "غیر پیداواری" کہتے ہیں لیکن روس کے لئے وہ اس "خرچ" کو ضروری
قرار دیتے ہیں وہ صاف کہتے ہیں کہ دنیا کے سامراجی ملکوں کی نگاہ بد روس پر ہے اور ان سامراجی
ملکوں کے "ہتھیار گھر" ہتھیاروں سے بھرے پڑے ہیں۔ امن پسند رابندر ناتھ نے ایک بار بھی یہ
نہیں کہا کہ یہ فضول خرچ، غیر پیداواری خرچ بند کر دیا جائے۔ روس کے لئے ایسا مشورہ
نہیں دیا۔ حالانکہ انہوں نے دیکھا تھا کہ روسی عوام "کس طرح اپنا پیٹ پال رہے ہیں" اس سے

صاف ہے کہ ٹھاکر ایسی جنگ کے حامی تھے جو عوام کی بقا کے لئے ہو اور سامراجیت اور فسطائی طاقتوں کے خلاف ہو۔ ناانصافی کے خلاف، ظلم کے خلاف، سامراجیت کے خلاف، فسطائیوں کے خلاف، جنگ کے لئے للکارنے کو انہوں نے ہمیشہ حق بجانب قرار دیا۔ ان کا یہ شعر صاف کہتا ہے:۔

"اب سنبھالو
اپنے پورے بدن کو
جنگی ساز سے"

جنگ اور امن کے سلسلے میں ربندر ناتھ کو درست طور پر سمجھنے کے لئے تاریخ عالم کا اور خاص کر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا کچھ علم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ٹھاکر کو سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صرف بیس برس کی عمر میں (۱۸۸۱ء) سامراجیت کی لوٹ کے سلسلے میں ان کا شعور بیدار ہو چکا تھا اور انہوں نے سامراجیوں کی چین میں افیون کی تجارت کے سلسلے میں کھل کر مخالفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کس طرح سامراجی ایک عظیم ملک چین کے عوام کو افیون کے نشہ میں سلا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ہے سامراجی طریقہ تجارت، اور ٹھاکر نے لکھا کہ یہ کھیل ایک طویل عرصہ سے انگریز کھیلتے رہے اور ایشیا کی ایک بڑی قدیم تہذیب یافتہ ملک کو لوٹتے رہے۔ ملک ملک میں سامراجی صرف تجارتی ہی لوٹ نہیں مچاتے ہیں بلکہ ان ممالک کو اپنے پنجے میں جکڑنے کے لئے فوجی طاقت کے علاوہ مذہب کی تبلیغ کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ ٹھاکر یہ سب باتیں بیس برس کی عمر میں اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور انہوں نے سامراجیوں کے خلاف مضمون "امپیریالیزم (Imperialism) میں جو ۱۹۰۵ء کی تخلیق ہے، کھل کر لکھا۔ یعنی پہلی عالمگیر جنگ سے بہت پہلے انہوں نے سامراجیوں کی لوٹ کھسوٹ سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب ایک بھیانک تباہ کن جنگ ہوگی۔ انہوں نے اس طرف اشارہ "بلاکا" کی چند نظموں میں کرتے ہوئے کیا:۔

"خونی بادل چمک رہے ہیں
آسمان پر برق گرج رہی ہے

وحشی پاگل

بار بار ڈرودانی ہنسی ہنس رہا ہے

اب تباہی اور بربادی آنے ہی کو ہے"

جنگ و امن کے مسئلہ پر "اہنسا کے پجاریوں" کی طرح وہ "شانتی شانتی" کا راگ الاپنے کو کمزوری سمجھتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کی بھیانک تباہی ان کے خیال سے لازمی تھی۔ اس کے علاوہ ابتدا ہی سے ان کو یقین تھا کہ اس جنگ سے، خونی دریا سے، ایک "نئی طاقت" ابھرے گی جو "تباہی" کا ثمر ہوگی۔ کیا ان کا اشارہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کی طرف نہیں تھا۔؟ جنگ سے دو ماہ پہلے انہوں نے نظم "سنکھ" (ناقوس) کہی اور اس نظم کے سلسلے میں لکھا۔

"یہ نظم جب کہی گئی اس وقت جنگ شروع ہونے کو دو ماہ باقی تھے۔ اس کے بعد سنکھ بج اٹھا، جو جنگ ہوئی ہے اس نے نئے دور کا دروازہ کھول دیا ہے —— اور اب بھی سورگ (جنت) کا سفر شروع نہیں ہوا ہے۔ اور بھی دیواریں گریں گی۔ محدود اور تنگ دیواریں ٹوٹیں گی۔ مست آوارے نکل چکے ہیں۔ راستوں پر۔ پچھم کے ملکوں میں دیکھ آیا ہوں کہ گھر چھوڑ کر بدمست آوارے نکل پڑے ہیں۔ ان لوگوں نے ایک سنہرے مستقبل کا سپنا دیکھا ہے۔ اس زمانے کا خواب جو زمانہ سب لوگوں کا ہوتا۔ شہد کی مکھی کا چھتا ٹوٹ چکا ہے اور مکھیاں نکل چکی ہیں۔ نئے گھر کی تعمیر کے لئے سنکھ کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔ روماں رولاں، برٹرنڈ رسل جیسے لوگ اس گروہ میں ہیں ان کی بے عزتی کی گئی ہے چونکہ وہ جنگ کے خلاف تھے۔ ان کو جیل کی سزائیں ہوئیں۔ سب کی بھلائی کی بات کہنے پر اس گروہ کے کتنے جانے انجانے لوگ راہ راہ پر بھٹکتے پھر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ صبح ہونے میں اب دیر نہیں ہے۔ پرندے جس طرح آمد صبح کو جان لیتے ہیں یہ لوگ اسی طرح نئی دنیا کی آمد آمد کا اندازہ لگا چکے ہیں۔"

مذکورہ اقتباس کو پیش کرتے ہوئے شری جیوترمے گھوش[۵] نے لکھا کہ یہاں رومارولا اوربرٹ رنڈ رسل کے نام خاص کر قابل غور ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں رومارولا نے "آزادی کا اعلان نامہ" پر ٹھاکر کا دستخط چاہا۔ اس پر انہوں نے بخوشی دستخط کیے تھے۔ یہ وہی مشہور اعلان نامہ ہے جس پر دنیا بھر کے نامور دانشوروں نے دستخط کیے تھے مثلاً گورکی، برٹرنڈ رسل، اسٹیفن جوایگ، ہیرمین ہسں، سلمہ لاگریف، اپٹن سن کلیر، آپٹن سنکلیر، بیبٹھ اور فرانس کے کمیونسٹ رہنما آری باربس وغیرہ۔ اس کے علاوہ آری باربس نے جو اعلان نامہ ٹھاکر کو روانہ کیا تھا اس پر ٹھاکر نے دستخط کیے تھے۔ اس اعلان نامہ میں اشتراکی سماج کو قائم کرنے کے لیے مزدوروں کی تائید کی گئی تھی۔ تاریخ کا تجزیہ کر کے رابندر ناتھ یہ سمجھ گئے تھے کہ انسانیت کی بقا کی خاطر جنگ جائز ہے لہذا سامراجیت کے خلاف، شیطانی طاقتوں کے خلاف، انسانی وجود کے لیے، جو جنگ لڑی جائے، ٹھاکر نے اسے جائز قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں:۔

بہادروں کے خون کے بہتے دھارے
اور ماں کے بہتے آنسوؤں کی
کیا کوئی قیمت نہیں ہے ——— ؟
کیا یہ آنسو صرف ریت میں جذب ہو کر رہ جائیں گے ؟
کیا جنّت کی تعمیر نہیں ہوگی ؟
رات کی تپسّیا سے، قربانیوں سے
کیا نئی سحر، نیا دن طلوع نہیں ہوگا ——— ؟"

۱۹۱۵ء میں پہلی جنگ عظیم کے وجوہات بتاتے ہوئے ٹھاکر نے مضمون "بنیادِ جنگ" میں لکھا:۔

"اب تجارت، محض تجارت نہیں ہے "سامراجیت" کے ساتھ "تجارت" کی شادی ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تاجر سامانِ تجارت کی لین دین

---

[۵] ہفتہ روزہ "پچھم بنگہ" رابندر ناتھ نمبر ۱۹۸۴ء کلکتہ۔

کرتا تھا اور اب تاجر "انسانوں" کی تجارت کرتا ہے یعنی انسان بھی
اب "سامان تجارت" بن گئے ہیں۔ عہد قدیم اور عہد جدید کی تجارت
میں نمایاں فرق ہے۔ اب تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ سامراجیت
کا پھیلاؤ ہو رہا ہے۔ تاریخ عالم میں یہ ایک بالکل بدلی ہوئی شکل
ہے یعنی ایک ملک دوسرے ملکوں پر حکومت کرتا ہے اور مزے کی بات
یہ ہے کہ یہ دونوں ممالک سمندر کے آر پار ہیں۔ یورپ کی سامراجی تجارت
گاہ اب ایشیا اور افریقہ کے ممالک ہیں۔"

ٹھاکر نے ۱۹۱۵ء میں سامراجیت کا جو روپ دکھایا تھا اس میں آج ستر (۷۰) سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے ٹھاکر نے اسی مضمون میں اور بھی کئی حقیقی باتیں لکھی ہیں جو آج بھی غور طلب ہیں مثلاً:-

"ایک زمانہ تھا جب چھین لینے یا لوٹ لینے کے لئے مذہب کی باتیں کرنے
کی ضرورت نہیں تھی لیکن آج نقشہ بدل گیا ہے اب مذہب کی بھی
ضرورت ہے۔ سامراجی تجارت کے پھیلاؤ میں بھی مذہب کا بھی خوب
استعمال ہوتا ہے۔ آج نصیحت کرنے والے جرمنی پنڈت کہتے ہیں کہ جو
کمزور ہیں وہ مذہب کی دہائی دیتے ہیں لیکن جو طاقت ور ہیں ان کو
مذہب کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے جسمانی طاقت کافی ہے
آج جرمنی کا کہنا ہے کہ دنیا میں دو طاقتیں ہیں، مالک (سرمایہ دار)
اور غلام (مزدور) سب کچھ مالک کی جاگیر ہے اور غلام کا کام ہے مالک
کے لئے سب کچھ تیار کرنا۔"

پھر ۱۹۲۳ء میں یورپی سامراجیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں ـــــ رفتہ رفتہ یہ دیکھا گیا کہ یورپ سے باہر یورپ نے جس مشعل کو روشن کیا ہے وہ مشعل روشنی پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ آگ لگانے کے لئے ہے ـــــ اس کے تین سال بعد ٹھاکر نے نظم "افریقہ" کہی اور بتایا کہ کس طرح یورپی سامراج افریقہ کو غلام بنائے ہوئے ہے اور افریقی عوام پر کیسے کیسے مظالم

ڈھائے جارہے ہیں۔" کالا انتر" میں انہوں نے یورپ اور امریکا میں افریقہ کے کالے باشندوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:-

> "آج متحدہ امریکا میں نگرو کی سماج میں کوئی عزّت نہیں ہے اور جب کسی نگرو بدنصیب کو زندہ جلایا جاتا ہے، تب گورے چمڑے والے بربریت کے اُس وحشی منظر کو دیکھنے کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں آکر جمع ہوتے ہیں اور اس وحشیانہ منظر کو دیکھ دیکھ کر مرد و زن لطف اٹھاتے ہیں۔"

پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں (۱۹۱۷ء) وہ امریکی سامراجیت کا ننگا چہرہ دیکھ پائے تھے۔ انہوں نے مضمون" مالک کی مرضی کے مطابق کام" میں برٹش اور امریکی سامراجیت کا اصل چہرہ اُجاگر کیا پھر دوسری جنگ عظیم کی ابتدا میں (ستمبر ۱۹۳۹ء) ٹھاکر نے امیہ چکرورتی کو لکھا:-

> "سامراجی طاقتیں خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہی ہیں کہ جنگی جاپان نوچ نوچ کر چین کو کھا رہا ہے۔ آخر کار چین کو تمام تر بے عزّتی برداشت کرنی پڑی...... دیکھا، کہ وہ سامراجی طاقتیں خاموش تماشائی بنی رہیں اور دیکھتی رہیں کہ کس طرح اٹلی نے ابی سینا کو نگل لیا اور دوستی کے نام پر انہوں نے مدد دی جرمنی کے جوتوں تلے چکوسلواکیہ کو رہنے پر.... دیکھا اسپین کا دیوالیہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ "میونک پیکٹ" کے نام پر ہٹلر سے ایک بے معنی سمجھوتہ کر کے خوش ہوتے ہوئے۔"

جاپانی سامراجیت کے خلاف بھی شاعر نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ مجموعہ کلام سانائی (شہنائی) کی نظم اپ گھات ایک بہترین مثال ہے اس کے علاوہ انہوں نے طنزیہ مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً:-

> "جاپانی، جاپانی
> اب جتنا بھی اچھلو کودو
> اور کرو بڑائی من مانی"

ٹیگور لندن میں برنارڈ شا کے ہمراہ —— ۱۹۳۰ء
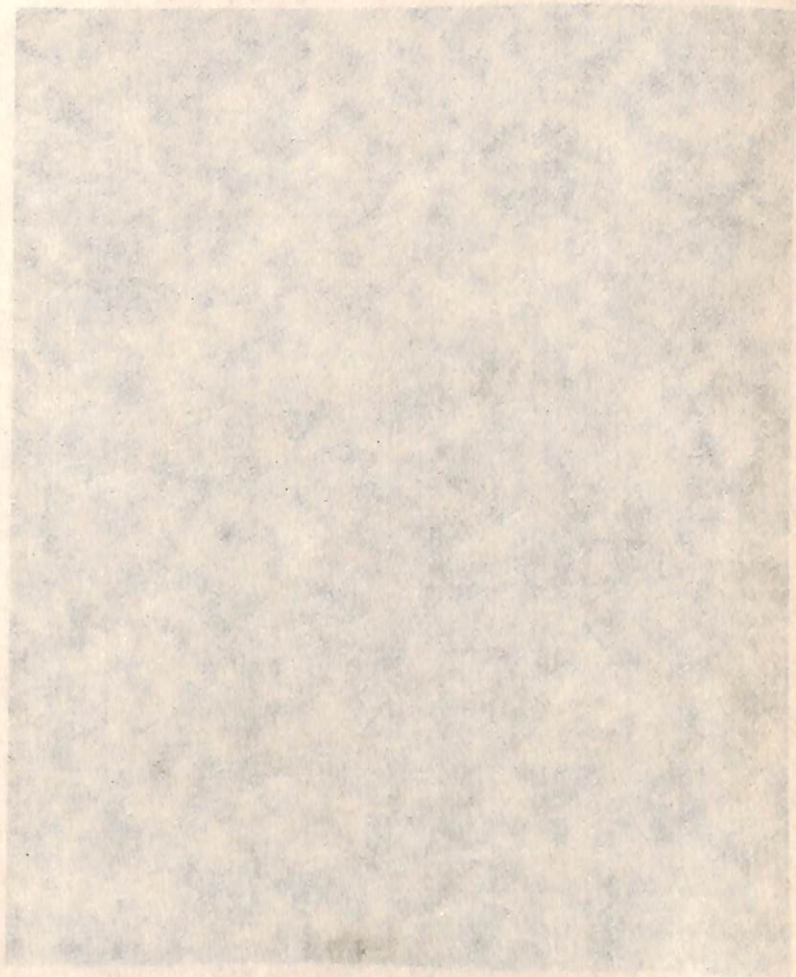
لیکن آخر کار
تمہاری ہڈی پسلی بھی پس جائے گی''

پہلی اور دوسری جنگ میں ایک بنیادی فرق رہا ہے اور اس بنیادی فرق کو جانے بغیر ربندر ناتھ نے دوسری جنگ کے دوران امریکی حکومت سے جنگ میں شامل ہونے کی جو درخواست کی تھی اس کی اصلیت کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہ بنیادی فرق ہے سامراجیت اور فاشسٹ (فسطائی) قوتوں کا۔۔۔ دوسری جنگ عظیم میں فسطائیوں اور نازیوں کی قوت دنیا کے لئے سامراجیت کی تباہ کاریوں سے بہت زیادہ خطرناک تھی۔ اس فرق کو وہ سمجھ گئے تھے۔ لہذا انہوں نے فسطائیوں اور نازیوں کی شکست کی تمنّا کی اور کہا۔

''اس جنگ میں فرانس اور انگلستان فتح مند ہوں، یہی میری تمنا ہے، کیوں کہ انسانیت کی تاریخ میں فسطائی اور نازی قوتوں سے بڑھ کر اور کوئی تباہ کن قوت نہیں ہے لیکن میں سب سے زیادہ ملول ہوں چین کی حالت سے، چونکہ سامراجیوں کے پاس بے پناہ سرمایہ ہے اور ان کے ہمدرد بھی بہت ہیں۔ لیکن چین خالی ہاتھوں سے لڑ رہا ہے اور اس کا کوئی مددگار نہیں ہے!''

جنگ اور امن کے مسئلہ پر ربندر ناتھ کبھی خاموش رہے وہ امن کے حامی ضرور تھے لیکن وہ انصاف کے لیے ضرورت ہو تو حملہ کرنے کے حق میں بھی رہے انہوں نے ہمیشہ مظلوم عوام کے حقوق کا ساتھ دیا۔ جب جاپان نے چین پر حملہ کیا اور بربریت کا ننگا ناچ شروع ہوا تو انہوں نے کھل کر فاشسٹوں کی مخالفت کی چین پر جاپانی حملے کی تائید کرتے ہوئے جب جاپانی شاعر نگوچی نے ٹھاکر کو خط لکھا اور اس سلسلے میں ان کی حمایت چاہی تو ٹھاکر نے کھلے الفاظ میں نگوچی کو لکھا کہ کسی طور پر بھی وہ فاشسٹ جاپان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ نگوچی اور ٹھاکر کے درمیان یہ خط وکتابت ایک تاریخی دستاویز ہے۔ فسطائیت کے خلاف ایک اور اہم دستاویز ربندر ناتھ کا وہ ٹیلی گرام ہے جو پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، بلجیم، ہالینڈ اور آخر کار ۱۴ر جولائی ۱۹۴۰ء کے دن شہر پارس پر جرمن کا قبضہ ہو جانے اور فرانس کے وزیر اعظم کا رورو کر امریکی

صدر روزویلٹ سے امداد کی اپیل کرنے کے بعد ۱۵ جولائی کو کالمپونگ سے رابندر ناتھ نے صدر روزویلٹ کے نام بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ اب امریکا کو فاشسٹوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینا چاہیئے۔

دوسری جنگ عظیم کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ برطانیہ اور امریکا جیسے سامراجی ممالک فسطائیوں اور نازیوں کی خوشامد کر رہے تھے۔ وجہ تھی روس کا خاتمہ کرنا۔ لیکن جب اس مقصد کو سامراجی حاصل نہ کر سکے اور فاشسٹ قوتیں، قوی ہیکل وحشی دیو کی طرح منہ کھول کر خود ان کی طرف بڑھنے لگیں، تب برطانیہ، فرانس اور امریکا میں سمجھوتہ ہوا۔ رابندر ناتھ نے ایسے ہی موقعہ پر امریکا کو آواز دی تھی اور یہ تمنا کی تھی کہ اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس فتح مند ہوں، چونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ فاشسٹ اور نازیوں کے مقابلے میں سامراجی سماج بہتر ہے حالانکہ وہ سامراج مخالف تھے، لیکن یہاں دونوں میں سے ایک کے انتخاب کا سوال تھا۔

رابندر ناتھ دوبار اٹلی گئے۔ پہلی بار ۱۹۲۵ء میں اور پھر ۱۹۲۶ء میں۔ اٹلی کے مختلف شہروں میں شاعر کا خوب خیر مقدم کیا گیا۔ ان دنوں ہندستان میں مسولینی کو عام طور پر برا نہیں سمجھا جاتا، چونکہ ہندستان انگریزوں کا غلام تھا اور مسولینی انگریز دشمن تھا، اس لئے مسولینی سے یہاں ہمدردی کے جذبات پائے جاتے تھے۔ ۱۹۲۶ء سے قبل اٹلی کے فاشسٹوں کے سلسلے میں رابندر ناتھ کے خیالات بھی واضح نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے مسولینی کے خلاف کچھ کہا تھا۔ لیکن اس سال جب وہ اٹلی گئے، تو سوئزرلینڈ میں رومارولا نہایت بے چینی سے ٹھاکر کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ اٹلی سے لوٹ آئیں تو فاشسٹوں کے سلسلے میں کھل کر ٹھاکر سے باتیں کریں۔ جب ٹھاکر اور رومارولا کی ملاقات ہوئی تو رومارولا نے نہ صرف ان کو فاشسٹوں کی حقیقت سے آگاہ کیا بلکہ فسطائیوں کے حملوں اور مظالم سے جو لوگ بھاگ کر سوئزرلینڈ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان سے ٹھاکر کی ملاقات کرائی۔ رومارولا نے اپنی ڈائری میں ٹھاکر سے ان کی ملاقاتوں اور کس طرح ٹھاکر مسولینی سے متاثر ہوئے تھے کے سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ بہرحال جب ٹھاکر حقیقت سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے مسولینی اور فاشسٹوں کے خلاف کھل کر لکھا اور اسی

فاشسٹ مخالفت کا نتیجہ ہے کہ مسولینی نے شانتی نکیتن سے اتالوی زبان کے استاد پروفیسر تچی کو واپس بلا لیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جنگ اور امن کے موضوع پر ٹھاکر نے لکھا:۔

"سامراجیوں کے ظلم وستم سے آج سمندر کے کنارے کنارے جگہ جگہ پر موت رقصاں ہے انسانی سماج میں شیطان جاگ اٹھے ہیں۔ انسان کی زندگی ان کے لئے ایک کھیل ہے انسانی تاریخ میں کیا یہ شیطانیت ہی حرف آخر ہے؟ انسان میں یہ جو شیطان ہے کیا یہی حقیقی ہے؟ اس جنگ کے بھیانک ماحول میں بھی امن کی کوشش جاری ہے یہ بات اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب دیکھتا ہوں کہ اس دکھ بھرے دنوں میں چند عظیم ہستیاں امن کا پرچم لئے کھڑی ہیں! امن کے لئے وہ موت کو بھی گلے لگا رہے ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے سامراجی ان پر ظلم کرتے ہیں پھر بھی ان کی طاقت کو مٹا نہیں پاتے اب بھی ایسے انسان ہیں جو ہر مصیبت کو جھیل کر مستقبل کی روشنی کی بات کہہ رہے ہیں۔"

اسی سال رابندر ناتھ نے مجموعۂ کلام شیاملی کی تخلیق کی اور فاشسٹوں کے خلاف عوام کو ہشیار کرتے ہوئے کہا:۔

"ناگن
چاروں طرف
اپنے زہریلے سانس چھوڑ رہی ہے!
ایسے میں
"امن امن" کہنا ایک مذاق ہے
لہذا آج، وقت الوداع
آواز دے رہا ہوں
ان بہادروں کو
جو گھر گھر میں تیار ہو رہے ہیں

شیطان کے خلاف جنگ کے لیے"

آخر ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے سوویت روس پر حملہ کر دیا۔ رابندر ناتھ ان دنوں سخت بیمار تھے۔ ان کی زندگی کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ لیکن فاشسٹوں کے اس حملے پر وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ ان ہی دنوں انہوں نے "ایکیا تان" (میلاپ کا راگ) جیسی عظیم نظم کہی جس سے انہوں نے محنت کشوں کی جے کا نعرہ لگایا اور کہا۔

"میں شاعر جہاں ہوں
جہاں کہیں بھی محنت کشوں پر ظلم ہوتا ہے
میں ظلم کے خلاف ہوں،
میری بانسری میں اُن کی آواز ہے،
اُن کا ترانہ ہے۔"

فاشسٹ ہٹلر کی آواز ریڈیو سے سننے پر بھی وہ غصہ میں آجاتے تھے۔ انہوں نے ہٹلر کی ریڈیو تقریر سن کر یہ طنزیہ اشعار کہے:۔

"ریڈیو سے سن رہا ہوں
موڈرن مونچھ والے کی دھمکی
ملک ملک کے
نگر نگر اور گاؤں گاؤں میں
کس دھوم سے وہ لوگوں کا گلا کاٹ رہا ہے
ریڈیو غوں غاں کر رہا ہے
کون جانے کس کی جیت ہوئی۔؟
مشین گن کی گولیوں سے ـــــ وہ
تہذیبی دنیا کی بنیاد کو مٹانے لگا ہے۔"

ان ہی دنوں رابندر ناتھ نے سامراجیت اور فسطائیت کے خلاف فیصلہ کن مضمون "سبھتار سنکٹ" (تہذیب کے لیے خطرہ) لکھا جس میں اعلان کیا کہ دنیا بدل

رہی ہے اور ہندستان بھی بدل رہا ہے سامراجیت مٹ جائے گی اور ہندستان سے بھی سامراجیت کا خاتمہ ہوگا۔ ان کے چند الفاظ ہیں:۔

"ایک نہ ایک دن انگریز کو ہندستان چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن کس ہندستان کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ جائیں گے؟ کیا غربت اور کوڑا کرکٹ کے ایک ڈھیر کو ۔۔۔۔۔۔ زندگی کے ابتدائی دور میں میرا وشواس تھا کہ یورپ ایک مہذب ملک ہے اور وہ تہذیب کا قدردان ہے اور آج جب میرا وقت رخصت ہے، وہ وشواس، وہ یقین بالکل ہی ختم ہوگیا ہے۔ اِس یقین کا "دیوالہ" نکل گیا۔ (شاعر نے خود لفظ "دیوالیہ" کا استعمال کیا ہے) ..... آج میں اس پار جانے والا مسافر ہوں اور سفر کے لئے قدم اٹھا چکا ہوں ...... لیکن انسان پر یقین نہ رکھنا گناہ ہے۔ مجھے انسان پر کامل بھروسہ ہے۔ اس یقین کو آخر تک ساتھ رکھوں گا امید کرتا ہوں کہ اس بھیانک تباہی اور بربادی کے بعد (یعنی دوسری جنگ کے بعد) آسمان سے بادل چھٹ جانے کے بعد، تاریخ میں ایک نئی روح آئے گی۔ اور اس کی ابتدا ہوگی اس پورب کی طرف سے، جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ اور وہ انسان جو کبھی نہیں ہارتا، کبھی نہیں مرتا، وہ اپنا سفر نئے سرے سے شروع کرے گا۔ راہ کی تمام بندھنوں کو توڑ کر، وہ آگے بڑھے گا اور انسانیت کی عظمت و وقار کو پالے گا۔ انسانیت کی شکست تسلیم کر لینے کو میں گناہ عظیم سمجھتا ہوں"۔

آخر دن تک، جب تک شاعر کو ہوش تھا وہ انسان کی مستقبل کی طرف دیکھتے رہے۔ شاعر کے قریب ان کے آخری وقت تک حاضر رہنے والے پرشانت چندر مہلانویش نے لکھا ہے:۔

"جب جرمن نے روس پر حملہ کیا، بیماری کے آخری دنوں میں بھی بستر

مرگ پر پڑے پڑے وہ بار بار پوچھتے رہے ــــ "روس میں کیا ہو رہا ہے؟" جس دن آپریشن ہوا، اس صبح، آپریشن سے آدھ گھنٹے پہلے، میرے ساتھ آخری بات ہوئی ــــ "روس کی سناؤ ــــ" میں نے کہا ــــ "کچھ بہتر معلوم ہوتا ہے، غالباً ذرا کھڑا ہو پایا ہے۔" ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ بولے ــــ "ہو گا کیوں نہیں، ان لوگوں ہی سے ہو گا، وہ کر پائیں گے، وہ کر پائیں گے ــــ"

پرشانت چندر مہلانویش کے یہ الفاظ اس بات کا اعلان کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ٹھاکر مرتے تک انسان کی کامیابی پر کامل یقین رکھتے تھے اور ان کو مکمل بھروسہ تھا کہ محنت کش انسان، سامراجیت اور فاشزم کا مقابلہ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔

رابندر ناتھ کی تخلیقات پر ایک نظر

(۱) شاعری

رابندر ناتھ کی شاعری کے سلسلے میں پچھلے صفحات میں کئی باتیں آچکی ہیں اور ضرورت کے مطابق ان کے کلام کے مختلف حصّوں کا ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے پھر بھی بطور شاعر ان کے سلسلے میں کچھ اور کہنا ضروری ہے اور وہی یہاں عرض کرتا ہوں۔

رابندر ناتھ ٹھاکر کی سب سے بڑی پہچان کیا ہے؟ شاعر یا گیت کار؟ — فیصلہ کرنا دو بھر ہے یہی کہنا پڑتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ شاعر اور گیت کار دونوں تھے۔ چونکہ کبھی وہ کہتے ہیں — میں شاعر ہوں، اور کبھی کہتے ہیں — "لوگ سب کچھ بھول جائیں گے لیکن وہ میرے گیت بھلا نہیں سکتے"۔ یعنی ان کو یقین تھا کہ وہ اپنے گیتوں کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ شاعری انہوں نے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے کی ہے چونکہ وہ لوگ ہی شاعری کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں اور گیت انہوں نے عوام کے لئے لکھے اور گائے ہیں۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں فنون کا آپسی تعلق نہایت گہرا ہے دونوں کا تعلق الفاظ کے حُسن ترتیب سے ہے۔ ایسا تعلق جسے ہم چولی دامن کا ساتھ قرار دیتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ گیت میں الفاظ کی زندگی "سُر" سے دی جاتی ہے۔ پچھلے صفحات میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ شاعری کا تعلق ایک مخصوص زبان سے ہے جس زبان میں شاعر شعر کہتا ہے اور شاعری کا ترجمہ عمومًا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ چونکہ شاعری میں اوزان، الفاظ کا انتخاب اور ترتیب وغیرہ کی بنیادی اہمیت

حاصل ہے یعنی رنگینیٔ بیان میں شاعر کا کمال بہت بڑی حد تک پوشیدہ ہے اور ترجمے میں اس کمال کو کسی طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ صرف شاعر کے خیال کی ترجمانی کی جا سکتی ہے اور بس۔

اردو میں ٹھاکر کی شاعری کا بہت ہی کم ترجمہ ہوا ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ بھی بیشتر انگریزی سے یعنی وہ ترجمہ در ترجمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کی روح کو اردو والے ابھی تک نہیں پا سکے اور ان سے وہ مکمل انصاف نہیں کر پائے۔ مخدوم محی الدین نے ٹھاکر کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے؎:-

"سونار توری (سونے کی کشتی) ..... کی اشاعت سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کے شعری اور ذہنی رجحانات کا دھارا مجاز سے حقیقت کی طرف مڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگی اور شاعری پر مذہبی رنگ پڑنا شروع ہوتا ہے اور متصوفانہ شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔۔ جب تخلیقی قوتیں تھک جاتی ہیں۔ تو پھر آرٹ روحانی تشنگی کو بجھا نہیں سکتا۔ اس لئے رابندر ناتھ ٹھاکر نے مذہب کے دامن میں پناہ لی۔ اب ان کی شاعری مذہب اور تصوّف کے نقاب میں جلوہ گر ہونے لگی... ٹھاکر کے شعری اور نثری کارنامے اس کے شاہد ہیں کہ یہ جب تک جوان تھے، اس زمانے کی شاعری، ڈراموں اور دوسرے ادبی کارناموں میں جذبات و خیالات کی وہی شدت ہے اور محبت کی پرستاری میں وہی والہانہ غلو اور طبیعت میں وہی لاابالی پن ہے جو ایک نوجوان عاشق میں ہونا ضروری ہے۔ کہیں رادھا کرشنا کی آسمانی محبت کے پردے میں اپنی ذات کو بے نقاب کرتے ہیں، اور کہیں بلا واسطہ اپنی واردات و کیفیات قلب کی ترجمانی اور بے حجاباتی حسن و عشق کے اسرار کی پردہ دری کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نوجوانی کے

؎ ٹیگور اور ان کی شاعری۔ مخدوم محی الدین ص ۷۰ اور ۷۵۔ ۷۶

دور شاعری میں پیغام کی تلاش کرنا بے سود ہے وہ اس وقت
معلم اخلاق نہیں بلکہ صرف عاشق تھے۔ بوڑھے نہیں بلکہ جوان تھے
فلسفی نہیں بلکہ آرٹسٹ تھے جیسے موسم بہار میں پھول کھلنے کا کوئی
مقصد نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ یہ اس کی شگفتگی کا موسم ہے یا جیسے
کوئی خوشنوا پرند کسی غرض کے لئے نہیں گاتا۔ بلکہ یہ اس کی مستور مسرتوں
کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے بالکل ایسے ہی ٹھاکر کی جوانی کے نغمات کا
مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایک عاشق کی روح کو جس میں جوانی
کی ترنگیں ہیں ایسا کرنا چاہئے تھا ——"

رابندر ناتھ کی شاعری کے سلسلے میں ایسے خیالات پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جاسکتا۔ مخدوم کا موضوع رابندر ناتھ اور ان کی شاعری ہے لیکن وہ ٹھاکر کے کلام کی روح کو نہیں پاسکے۔ اور یہاں تک کہا کہ "ان کی نوجوانی کے دور شاعری میں پیغام کو تلاش کرنا بے سود ہے اور "ٹھاکر کے جوانی کے نغمات کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کے ایک عاشق کی "روح" ہے اور پھر جوانی کے بعد کے دور کا ذکر کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ٹھاکر کو محض ایک "معلم اخلاق" قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "رابندر ناتھ ٹھاکر نے مذہب کے دامن میں پناہ لی ہے چونکہ ان کی تخلیقی قوتیں تھک گئی ہیں اور اب ان کی شاعری مذہب اور تصوف کے نقاب میں جلوہ گر ہونے لگی"۔ ایسے خیالات سے یہ واضح ہے کہ مخدوم نے ٹھاکر کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ ورنہ ٹھاکر کی جوانی کی شاعری میں ان کو وہ تمام باتیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایسی باتیں پاتے جو برسوں بعد وہ خود ایک ترقی پسند شاعر ہونے کی وجہ سے کہنے لگے تھے۔ ان غلط فہمیوں کی وجہ ٹھاکر کے کلام کا درست ترجمہ نہ ہونا ہی ہے۔

"سونار توری" جس نظم کا نام خود مخدوم نے لیا ہے یا تو وہ نظم ان کی نظر سے نہیں گزری ہے یا اگر گزری ہے تو وہ اس نظم کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ یہ نظم ۱۸۹۱ء کی تخلیق ہے (مجموعہ کلام ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا) پچھلے صفحات میں اس نظم کا ذکر کیا جا چکا ہے اور کہا گیا ہے یہ نظم جاگیردارانہ نظام کے زوال کا زمانہ پیش کرتی ہے کسان کی فصل کشتی میں بھر لی جاتی ہے اور کشتی دور چلی جاتی۔ لیکن اس کشتی میں کسان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اس نظم میں ایک عظیم فلسفہ بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ

"کام کا ثمر" ہی سب کچھ ہے۔ "پھل" ہی کی قدر و قیمت ہے اور انسان اس کی وجہ ہی سے جانا جاتا ہے کہ اس نے کیا کام انجام دیا۔ دنیا انسان کے کام کے "پھل" کو قبول کر لیتی ہے اور یہی کام کرنے والے کی کامیابی ہے اگر کسی کے کام کے "پھل" کو قبول کر لیا جائے۔ کشتی بھر لی جائے تو اس کا کام کامیاب ہے ــــــ مشہور نظم "ایک بار پھر او مورے" (اب مجھے لوٹا دو) بھی اسی زمانے کی نظم ہے جس میں شاعر اعلان کرتا ہے کہ اب وہ مزدوروں اور کسانوں کے حق کے لئے آواز بلند کرے گا ان کے گیت گائے گا اور نہ صرف خود گائے گا بلکہ دوسروں کو بھی محنت کشوں کے گیت گانے پر مجبور کرے گا اور خود مزدوروں اور کسانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم ظالموں سے مت ڈرو، وہ ظالم تم سے زیادہ کمزور ہیں۔ صرف ضرورت ہے تم میں ہمت کی، اتحاد کی ــــــ یہ سب نظمیں ٹھاکر نے ان دنوں کہیں جب ان کی عمر ۳۰ تا ۳۲ رہی ہے یعنی جب شاعر جوان تھا۔ کیا یہ کسی عاشق کے گیت ہیں؟ مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں لیکن صرف کہنا یہی ہے کہ اردو میں ٹھاکر کی شاعری کا درست ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے اردو دنیا نے شاعر کے پیغام کو درست طور پر نہیں سمجھا۔

رابندر ناتھ کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے نامور ادیب و محقق سکمار سین نے درست لکھا ہے۔

> "رابندر ناتھ ٹھاکر کو نہ تو مائیکل مدھو سودھن دت کی جدید شاعری سے وابستہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کا تسلسل یا سلسلہ بہاری لال چکرورتی کی رومانیت سے ہے۔ ان کا تعلق کسی مکتب یا طرز فکر کے سلسلے سے نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آپ ہی سب سے الگ تھلگ کھڑے ہیں اور ان سب کے باوجود ان کی تخلیقات کی جڑیں، ان کے وطن کی سرزمین کی گہرائیوں میں پیوست ہیں وہ اسی زمین کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اس دھرتی اور یہاں کی قدیم شاعری کے سرچشموں سے سب سے زیادہ فیض اٹھایا۔ ملک کی عظیم قدیم قدروں سے، قدامت پرستی کے دامن سے بچ کر فیض اٹھایا۔

لہ تاریخ بنگلہ ادب۔ ڈاکٹر سکمار سین۔ صفحات، ۸۱ - ۸۲ - ۸۴ - ۵۳ - ۵۵۴

بھائی داس کے خوشگوار حسین و فطری نقش و نگار اور دلنشین شاعری
کی پُر جذبات موسیقی کے جوہروں سے دامن کو بھر لیا ہے وہ ایک طرف
ہندستانی شاعری میں سب سے زیادہ ہندستانی ہیں تو دوسری طرف سب سے
بڑھ کر بین الاقوامی۔ ان کے دل کا دامن ہمیشہ کونے کونے سے اچھائیوں
کو، خوبیوں کو، سمیٹ کر بھرتا رہا ہے۔ انگریزی شاعری سے، بنگلہ موسیقی
سے، کلاسیکی نقش و نگار سے حتٰی کہ معمولی ترنم سے لیکن جو کچھ بھی انہوں نے
قبول کیا اس کو اپنا بنا لیا۔ اپنے رنگ میں اس طرح رنگ لیا کہ وہ ان کا
اپنا ہو کر رہ گیا ...... ٹھاکر نے موسیقی سے پُر شاعری کو انتہائی لطافت
نزاکت، صفائی اور شائستگی ملی اور ان تمام خوبیوں نے موزوں
اشعار کے دامن کو بہت کشادہ کر دیا ...... چند نظمیں اور گیت
دونوں طرح تقطیع کے لائق ہیں یعنی شعری اوزان کے مطابق بھی
اور گیت کے لحاظ سے بھی۔ شاذ و نادر ہی کسی نظم کو گیت میں
ڈھالنے کے لئے الفاظ میں معمولی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔"[۱]

ٹھاکر نے سب سے کچھ نہ کچھ لیا ہے جو لینے کے لائق پایا۔ وہ اس کا اعتراف بھی کھلے دل سے کرتے ہیں کہ شاعر ہر جگہ اور ہر شئے سے لے سکتا ہے۔ اگر اس میں شاعر کی نظر ہو۔ ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ دورۂ یورپ میں کسی نے ان سے پوچھا — "ہندستان میں کوئی بڑا شاعر بھی ہے" — ٹھاکر نے جواب دیا — "بڑا شاعر تو میں خود بھی نہیں ہوں۔ ہاں شاعروں کی ہمارے ملک میں کمی نہیں ہے چرخہ کاتتی ہوئی عورتیں کچھ نہ کچھ گاتی رہتی ہیں۔ کسان بھی کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملاحوں کی بھٹیالی گیت اور باؤل بیراگیوں کے صوفیانہ گیت بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں اور ان سب گیتوں میں ہماری شاعری کی روح موجود رہتی ہے" — ٹھاکر نے بے جھجک اقرار کیا ہے کہ وہ ہر جگہ سے لیتے رہتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں[۲] —

---

[۱] پندرہ روزہ "مغربی بنگال" ٹھاکر نمبر ۱۵ / مئی ۱۹۷۸ء کلکتہ
[۲] ماہنامہ "پرباسی" بنگلہ سنہ ۱۳۴۵ مطابق ۱۹۳۶ء صہ ۸۲۱

"کم عمری میں شاعری شروع کی تھی اور میرے سامنے بہاری لال اور
اکھئے چودھری کا کلام تھا۔ لیکن کم عمری ہی میں نہ جانے کب وہ سرحدیں
ٹوٹ گئیں اور میں باہر نکل پڑا۔..... دیشی ودیشی سے کئی ترنگ آئے،
میرے دل نے، میری شاعری نے ان کو قبول کیا۔ ممکن ہو ان سے نے
میری شاعری کے جسم کو طاقت دی ہے، قوت دی ہے، لیکن کسی باہر کے
دباؤ نے میری شاعری کو نہیں بدلا۔"

"ہائیکو" ایک جاپانی صنف سخن ہے جو اردو شاعری میں نووارد ہے اور خاص کر پاکستان کے کئی شعراء مثلاً اداجعفری اور حمایت علی شاعر وغیرہ نے اس صنف میں نظمیں کہی ہیں۔ جاپان میں یہ صنف سخن کئی صدیوں سے مقبول ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف تین مصرعوں میں خیال کا مکمل اظہار کیا جاتا ہے۔ کلام ٹھاکر میں بھی ہم کئی نظمیں پاتے ہیں جن کو "ہائیکو" قرار دیا جا سکتا ہے چونکہ یہاں بھی صرف تین مصرعوں میں یہ بات مکمل طور پر کہی گئی ہے۔ ٹھاکر جاپان بھی گئے تھے ممکن ہے انہوں نے اس صنف سخن کو وہاں سے قبول کیا ہو لیکن ٹھاکر کے بیان کے مطابق جاپانی شاعری اور گیت ایسے نہیں ہیں جو متاثر کرتے ہوں وہ وہاں کی مصوری سے بے حد متاثر ہوئے تھے انہوں نے لکھا ہے ـــــ "جاپانیوں نے اپنا سب سکھ دکھ، امیدیں اور خواہشات کو تصاویر میں اجاگر کیا ہے۔" لیکن پھر بھی "ہائیکو" قسم کی نظمیں ان کے کلام میں کئی ہیں چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

(۱)

دونوں کناروں کو دور دور کر کے
سمندر بجتا ہے
برہا کے آنسوؤں کا گیت

لہ وشوا سہاۓ رابندرناتھ۔ از موہن تیاگی۔ ص ۱۲۹

(٢)

"اُجالا" جب محبت سے
"تاریکی" کے گلے میں مالا ڈالے
"تخلیق" اسی کا نام ہے

(٣)

غروب آفتاب کے بعد
آکاش، تاروں کا جپ مالا لیے
رات بھر آفتاب کا نام جپا کرتا ہے

(٤)

میرے آزاد خیالات
بلندی میں پرواز کرتے ہوئے
میرے گیتوں میں آبستے ہیں

"کوڑی و کومل" (۱۸۸۶ء) سے قبل کے مجموعۂ کلام کو شاعر کی ایک ایسی ابتدائی کوشش کہی جاسکتی ہے جہاں پہلی بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر منزل کی طرف قدم بڑھا چکا ہے حالانکہ اس کی نظموں کا موضوع عشق و محبت ہے اس کے بعد "مانسی" (۱۸۹۰ء) وہ مجموعہ ہے جس میں شاعر سماج کے فرسودہ روایات و رجحانات پر پہلی بار تنقید کرتا ہے پھر وہ اور آگے بڑھتے ہیں اور ـــ

"سونار توری" کا زمانہ آتا ہے۔ اس مجموعہ کی نظموں پر بنگال کے دیہی علاقوں کی زندگی کا گہرا نقش ہے چونکہ ان دنوں (۱۸۹۱ء تا ۱۸۹۷ء) شاعر اپنی زمینداری کے سلسلے میں شلائی داہ اور دیگر مقامات میں مقیم تھے۔ "سونار توری" (۱۸۹۳ء) میں شاعر عام لوگوں سے قریب ہے اور اس نے انسانی قدروں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش شروع کر دی ہے اس کے بعد شاعر انسان سے قریب سے قریب تر ہوتا ہو گیا اور ایک ایک قدم آگے ہی آگے بڑھتا رہا ہے۔ وہ اپنے وطن کی سرزمین سے آگے بڑھ کر، پورے ہندستان اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر عالم انسانیت کی طرف بڑھ گیا۔

جہاں تک اسلوب شاعری کا تعلق ہے ٹھاکر نے ہر قدم پر نئے نئے تجربے کئے اور کئی بت توڑے۔ وہ کسی ایک اسلوب پر دیرپا قائم نہیں رہے "اروشی" استعاروں کے استعمال کا ایک بہترین نمونہ ہے تو "بلاکا" (۱۹۱۶ء) اس سلسلے میں ایک اور آگے بڑھا ہوا قدم۔

ہر شاعر کے دل میں درد اور جذبۂ محبت ہوتا ہے لیکن ایسے شعراء جن کی دنیا "اپنے تک"، یعنی اپنی ذات تک محدود ہوتی ہے، جن کا غم نجی غم یا غم جاناں ہوتا ہے، وہ محض اپنی بات اپنا دکھ درد، رنج و غم، مشکلات، غربت، تکالیف اور ناکامیوں کا دکھڑا روتے ہیں چند شعراء وہ بھی ہیں جو آج کی بات نہیں کہتے اور نہ مستقبل کی سوچتے ہیں بلکہ وہ دنیا کو عہد قدیم عہد گزشتہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور اس عہد کو ہی ایک سنہرا دور قرار دیکر اس عہد قدیم کی تعریف کرتے ہوئے، کلاسکی انداز کی شاعری کرتے ہیں اور پڑھنے والوں پر وجدانی کیفیت طاری کر کے "ماضی" میں لے جا کر ان کو حسین یاد ماضی میں قید کر دیتے ہیں۔ ایسی تخلیقات میں بھی ذکر "انسان" ہوتا ضرور ہے لیکن ٹھاکر یہ سب کچھ نہیں کرتے ہیں وہ ہم سے آج کی باتیں کرتے ہیں اور ساتھ ہی آنے والے کل کو سدھانے اور بہتر بنانے کے لئے آواز دیتے ہیں۔ وہ کل جس کل میں ہم اگر نہ بھی ہوں تو ہماری اولاد ہوگی۔ مجموعہ کلام "پرانتک" (۱۹۳۸ء) سے لے کر "روگ سجائیے" "آروگیہ"، "جنم دینے" اور "شیس لیکھا" تک یعنی ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۱ء کے دور شاعری ٹھاکر کی شاعری کا آخری دور ہے اور یہی ان میں انسانیت کے عروج اور بلندی کا دور ہے۔ اس لئے بعض نقاد لکھتے ہیں کہ ٹھاکر بڑھاپے میں پہنچ کر پھر دوبارہ جوان ہو گئے۔ یوں تو کلام ٹھاکر میں انسان سے محبت کا جذبہ ہر دور میں رہا ہے لیکن اس دور میں یہ جذبہ نہایت ابھر آیا ہے۔

اور "انسان" سے مطلب یہاں سماج کے کرتا دھرتا، رئیس یا بڑے لوگ نہیں بلکہ وہ مظلوم لوگ ہیں جن کو ہم محنت کش کہتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ محنت کشوں کا یہ شاعر، شاعر ہے لہٰذا وہ ان شعراء کو پسند نہیں کرتا جن کی شاعری محض نعرہ بازی ہے ٹھاکر فنکار تھے وہ اسے ادب تسلیم ہی نہیں کرتے تھے جس میں فنی خوبیاں اور ادبی حسن نہ ہو۔ لہٰذا ایسے شعراء کو جو فن کی خوبیوں کو ترک کرکے شاعری کو نعرہ بازی میں تبدیل کرتے ہیں ان کی ٹھاکر نے ہمیشہ سخت مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں :۔

"حقیقی قیمت ادا نہ کر کے
ادب میں چوری سے شہرت چاہتے ہو
اچھا نہیں ہے، اچھا نہیں ہے
یہ نقلی بھیس
یہ "شوقین مزدوری"——"

نظم "نردیوتا کی پوجا" میں شاعر کہتا ہے —— "اولاد انسان" بچے بار بار لے آتے ہیں، امید کی نئی کرنیں —— اور پھر "دوشیش لیکھا" میں یہ امید کا رنگ اور بھی واضح ہو جاتا ہے :——

"وہ آرہا ہے عظیم انسان
وہ انسان
جس کی جے جے کار
آسمان تک پہنچ رہی ہے"۔

اور پھر "پراشچتہ" میں اعلان کرتے ہیں :۔

"دشوار پراشچت ادا کرنے کے بعد
کفارہ اور قربانیاں دینے کے بعد
نئی زندگی، نئی روشنی پھیلے گی
ایک نئے دیش میں۔"

ٹھاکر کا انسان جس سے ٹھاکر کو محبت ہے، وہ کون ہے۔ ٹھاکر نظم "آروگیہ" میں بتاتے ہیں۔

وہ جُگ جُگ سے، ہمیشہ سے
ڈور کھینچتے ہیں، کشتی چلاتے ہیں، بادبان اڑاتے ہیں
وہ، میدانوں میں
بیج بوتے ہیں، فصل کاٹتے ہیں
وہ کام کرتے ہیں
نگر نگر، ڈگر ڈگر۔"

اور ربندرناتھ ان ہی لوگوں کی جے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اپنی نظم "شیشو تیرتھ" میں

"جے ہو انسان کی
اس نئے آدم کی
اس ہمیشہ کی زندگی کی۔"

বহু দিন ধরে বহু ক্রোশ দূরে
বহু ব্যয় করি বহু দেশ ঘুরে
দেখিতে গিয়েছি পর্ব্বতমালা
দেখিতে গিয়েছি সিন্ধু।
দেখা হয় নাই চক্ষু মেলিয়া
ঘর হতে শুধু দুই পা ফেলিয়া
একটি ধানের শিষের উপরে
একটি শিশির বিন্দু॥

৭ই পৌষ ১৩৩৬
শান্তিনিকেতন

শ্রীরবীন্দ্রনাথ ঠাকুর

۲ موسیقی اور گیت

رابندرناتھ کو اپنی تخلیقات میں اگر کسی چیز پر اعتقاد یا کامل بھروسہ تھا تو وہ ان کے گیت ہیں جو بنگلہ زبان میں ان کے نام پر "ربندرسنگیت" کہلاتے ہیں انہوں نے اپنے گیتوں کے سلسلے میں بارہا کہا ہے کہ ان کے گیت لوگوں کے دلوں میں گھر کریں گے اور وہ ان گیتوں کے سہارے امر رہیں گے۔ گیت ان کی سادھنا ہے، تپسیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "مجھے یہ دنیا اور لوگوں سے محبت ہے اسی محبت کو میں نے اپنے گیتوں میں سمو لیا ہے۔ میری یاد میرے گیتوں میں محفوظ رہے گی اور باقی جو کچھ بھی ہے مٹ جائے گا ــــ" آج ربندرناتھ کے گزر جانے کے تقریباً نصف صدی بعد ان کی بات تسلیم کر لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ چونکہ آج ان کے گیت گھر گھر میں مقبول ہیں۔ ریڈیو کلکتہ ہو یا ریڈیو ڈھاکا ہر روز ربندرسنگیت کے پروگرام ہوتے ہیں۔ اور بنگالیوں کا شاید ہی کوئی ایسا کلچرل پروگرام یا جلسہ ہو جس میں مختلف فنکار ربندرسنگیت نہ گاتے ہوں۔

بنگال گیتوں کا دیش ہے۔ یہاں کے لوگ گیتوں کے متوالے ہیں۔ مقام میمن سنگھ (جو آج کے بنگلہ دیش کا ایک بڑا شہر اور ضلع کا صدر مقام بھی ہے) کے نام کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ایک انگریز نے جو وہاں کا دورہ کر رہا تھا یہ دیکھا کہ سب ہی لوگ گاتے بجاتے ہیں لہٰذا جب اس سے پوچھا گیا کہ آپ کے علاقے کے لوگ کیا کرتے ہیں تو اس نے جواب دیا "My men sing" یعنی میرے لوگ گاتے ہیں اور یہی ہوتے ہوتے اس علاقے کا نام ہو گیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن میمن سنگھی

گیت بھی مشہور ہیں۔ جناب سلیم اللہ فہمی نے بنگال کی دیہی زندگی (مشرقی بنگال) پر لکھتے ہوئے لکھا تھا۔[1]

"کشتیوں کی بازی ایک عجیب و غریب چیز ہے...... ان کا مقابلہ ہوتا ہے..... گانے بجانے میں بڑی افراط ہوتی جاتی ہے۔ ہارنے والا ہی گاتا ناچتا ہے اور جیتنے والے کا پوچھنا ہی نہیں.... کھیت اور کھلیانوں میں کام کرتے، کشتیاں چلاتے، غرض ہر موقعہ پر گانوں کا بے حد رواج ہے۔ بھٹیالی۔ ساری، جاری، باؤل، مرشدی، معرفتی وغیرہ لوک سنگیت ہر شخص کو سینکڑوں زبانی یاد ہوتے ہیں۔ جو گاتا ہے جی کھول کر گاتا ہے۔ موسیقی ان کی گھٹی میں ہوتی ہے۔ شاعر گویئے دیہات سے دیہات جاتے ہیں۔ نئے سے نئے گانے سات دنوں تک سناتے ہیں۔ وہاں چاول پیسے، جو مل گیا سمیٹا اور دوسرے گاؤں چل کھڑے ہوئے۔ ان کے چلنے کے بعد ایک مدت تک موسیقی کا طوفان بپا رہتا ہے جیسے دیکھئے یہ نئے نئے گانے گاتا ہی رہتا ہے۔ گانا، بجانا، بانسری بجانا........ ہر بڑے بوڑھے اور بچے کی فطرت میں داخل ہے۔"

رابندر ناتھ نے کتنے گیت لکھے کہنا مشکل ہے۔ عام طور پر خیال ہے کہ ان کے گیتوں کی تعداد تقریباً تین ہزار ہیں۔ صرف "گیت بیتان" میں دو ہزار پانچ سو گیت شامل ہیں۔ ٹھاکر نے گیت لکھ کر اور ان کو گا کر نہ صرف بنگالیوں کے دلوں میں گھر بنالیا بلکہ "گیتا نجلی" جو ان کے گیتوں کا ایک مجموعہ ہے، پر ہی ان کو "نوبل انعام" ملا ہے یعنی گیت لکھ کر ہی انہوں نے دنیا کا دل بھی جیت لیا۔

بنگلہ زبان کی شاعری میں کوئی استاد اور شاگرد کا سلسلہ نہیں ہوتا۔ لیکن موسیقی اور سنگیت میں یہ سلسلہ قائم ہے اس سلسلہ میں رابندر ناتھ کا تعلق "وشنو پور گھرانہ" (بنگلہ تلفظ بشنو پور) سے رہا ہے۔ اگر ہم سلسلے کی کڑیاں ملائیں تو یہ سلسلہ تان سین تک پہنچ جاتا ہے۔ تان سین کے دو

---

[1] رسالہ "خاور" ڈھاکہ۔ جون ۱۹۵۳ء۔

شاگرد پیر بخش (پکھاوج کے نامور استاد) اور بہادر سین، بنگال میں بشنوپور کے راجا رگھوناتھ سنگھ کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ اسی بہادر سین کے شاگردوں میں گدادھر چکرورتی، رام شنکر بھٹاچاریہ اور ناظر (پورا نام معلوم نہ کرسکا) مشہور ہوئے۔ رام شنکر بھٹاچاریہ کے شاگردوں میں کھیتر موہن گوسوامی، رادھیکا پرشاد گوسوامی، جدو ناتھ بھٹ، اننت لال بندوپادھیائے اور گوپیشور بندوپادھیائے نامور ہوئے اور رابندر ناتھ ٹھاکر نے سنگیت کی ابتدائی تعلیم اسی جدو ناتھ بھٹ سے پائی ہے اس طرح ان کا تعلق وشنوپور گھرانہ سے ہے۔

ابتدائی دور میں (۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۰ء) ٹھاکر صرف کلاسیکی سنگیت کے متوالے تھے خاص کر دھروپد راگ کے۔ اس کے بعد خیال، ٹپہ اور ٹھمری کی طرف جھکے لیکن ٹپے سے ان کو خاص لگاؤ رہا ہے۔ ٹھاکر نے اپنے دل کی ترجمانی گیتوں میں سب سے بہتر طور پر کی ہے مختلف ممالک کی تہذیبی تاریخ پر غور کریں تو ہم دیکھ پائیں گے کہ تہذیب کے ابتدائی دور میں گیت اور شاعری میں فرق نہیں تھا۔ اس عہد میں شاعر کی تخلیقات گیت ہی کی شکل میں ہوتی تھیں۔ رسم الخط یا تو ایجاد نہیں ہوا تھا یا اگر کسی ملک میں ہوا بھی تھا تو چند لوگ ہی رسم خط سے آگاہ تھے۔ لہٰذا شاعر کی زندگی کے بقا کا ایک ہی راستہ تھا کہ کلام کو سُر سے گائیں اور لوگ بطور گیت ان کو یاد رکھیں پھر رفتہ رفتہ سماج کی ترقی کے ساتھ گیت اور شاعری ایک دوسرے سے پرے ہٹ گئے۔ شاعری نے اپنی راہ الگ نکال لی۔ اس کے باوجود آج بھی ان دونوں میں سگی بہنوں کا رشتہ قائم ہے۔ ہندستان کی تہذیبی تاریخ ہی یہی ہے۔ رگ وید کے اشلوک سُر سے گائے جاتے تھے۔ ویدک عہد میں شاعری اور سنگیت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے اور دونوں کی دیوی سرسوتی کے روپ میں سامنے آئی۔ سینکڑوں سالوں تک یہی دھارا قائم رہا اور پھر الفاظ اور گیت شاعری اور سنگیت جدا جدا ہوئے۔ دونوں کے الگ الگ اصول قائم ہوئے۔ شمالی ہند میں ہندی گیتوں میں سُر (راگ راگنی) نے اہم مقام حاصل کر لیا۔ لہٰذا ہندستانی سنگیت میں راگ راگنی کو اہمیت حاصل ہو گئی اور الفاظ کم سے کم رہ گئے یعنی کوئی ایک مختصر مصرعہ یا دو چار الفاظ یعنی بول ہی ہندستانی راگ کے لئے کافی قرار دیئے گئے اور ایک مکمل گیت کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن بنگال میں ایسا نہیں ہوا۔ لہٰذا بنگالی سنگیت میں الفاظ کی اہمیت قائم رہی اور مکمل گیت گانے کی ضرورت باقی رہی اور آج بھی یہی ہے۔ شاعری

کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہر ایک فرد سمجھ سکے۔ چونکہ فن شاعری کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کا ایک ترقی یافتہ فن ہے اور پھر شاعری کو سمجھنے کے لیے تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اشعار کا درست مطلب سمجھنا مشکل ہوتا ہے اور نہ ہی شاعری کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے گیت اور شاعری میں ایک بنیادی فرق ہے حالانکہ دونوں میں خیال کی ادائیگی "الفاظ" ہی کرتے ہیں اور "چھند" (بحر) دونوں کے لئے ضروری ہے لیکن گیت میں "الفاظ" کو سُر اور تال سے نئی زندگی بخشی جاتی ہے لہذا گیت دلوں کو زیادہ موہ لینے کی قوت رکھتا ہے۔

بنگال میں سینکڑوں ایسے لوگ ہیں جن کا پیشہ ہی کسی نہ کسی قسم کے گیت گانا ہے۔ مثلاً چھڑا سنانے والے، کتھکتا کرنے والے، پانچالی گانے والے، جاترا کے گیت گانے والے، کوبی گیت والے، منگل گیت والے (عموماً اگر منشا منگل ہو تو عورتیں گاتی ہیں)، پدابلی والے اور پھر کرتن کرنے والے۔ ان سب گیتوں کی الگ الگ قسمیں اور سُر ہیں! اس کے علاوہ گاؤں گاؤں میں سینکڑوں باؤل ہیں جو باؤل گیت گاتے ہیں پھر ماجھی کے بھٹیالی گیت ہیں میمن سنگھی گیت ہیں، ساری گیت جاری گیت، مرشدی گیت، معرفتی گیت، شیاما سنگیت، آگ منی گیت، بھاؤآئی گیت، بگھیرا، بگھیرا چٹکا، الکاپ، ٹسو یا ٹسو، کرم گیت، جھومر گیت اور دیگر مختلف لوک گیت ہیں۔ اس کے علاوہ اکھڈائی، ہاف اکھڈائی، کھیمٹا اور ڈپ یا ٹپ بھی ہیں لیکن ان گیتوں کا تہذیبی معیار پست ہے اور عموماً اخلاق سے گری ہوئی باتیں ان گیتوں میں ہوا کرتی ہیں۔ بہرحال بنگال گیتوں کا ایک گلستان ہے۔ بنگال کے دو نوں بڑے شعرا ربندر ناتھ اور نذرالاسلام گیت کار بھی رہے اور ان دونوں نے بنگلہ زبان میں گیتوں کا انمول اضافہ کیا، جو گیت اب ان کے ناموں پر "ربندر سنگیت" اور "نذرل گیتی" کہے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال میں ربندر ناتھ سے گیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مشہور گیت کار دھرجٹی پرشاد مکھوپادھیائے نے ربندر ناتھ کے گیتوں کے سلسلے میں لکھا ہے[1]:-

> "ربندر ناتھ سُر میں ایک نیا طرز لائے۔ جس کا سنگیت کی دنیا میں تان سین کی "درباری کانڑا" یا "میاں کی ملہار" سے کم قدر و قیمت نہیں ہے۔ ربندر ناتھ

---

[1] ربندر ناتھ سمرتی رمدیر وشوا ناتھ دے۔ پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۶۱ء۔ صفحہ ۳۱۵

کے گیت مغل طریقہ یا ہندستانی سُر کے گیت نہیں ہیں جب سے ٹھاکر
نے دیہاتی گیت یعنی باؤل، کرتن اور بھٹیالی کو جانا تب سے ان کو اپنی
راہ ملی، آزادی ملی۔ اس سے قبل وہ نقل نویس تھے اور یہاں سے وہ
آزاد تخلیق کار ہوئے۔"

اور بقول دھرجٹی پرشاد "ٹھاکر نے دربار سے دور، شہر سے دور، گاؤں میں، عام لوگوں میں، ان کی زندگی اور تہذیب میں سنگیت کی تلاش کی ہے اور مٹی سے قریب ہوتے پر ٹھاکر کو نئی زندگی ملی مشہور ادیب اور نقاد سکمار سین نے ٹھاکر کے گیتوں کے سلسلے میں لکھا[1]

"موسیقی کا اسلوب، نغمے اور آہنگ کی تخلیق کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں ...... کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض نغمے، ساز پر قابل آزمائش نہیں ہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نغمے میں خود ہی اس کا سُر پوشیدہ ہے ...... ٹھاکر کے نغمے اور آہنگ میں بے پناہ کشش ہے، جو صرف لوک گیتوں کے طرز اور موسیقی کی ترقی یافتہ (یورپی بھی) بلند معیار کے مرکب ہونے ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ جب موسیقی اور نغمے میں اپنی بھرپور روانی ہو، وزن نغمہ اور حسن تمام خوبیوں کے گھل مل جانے سے ہی وجود میں آتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ٹھاکر کی موسیقی جادو کی طرح سر پر چڑھ کر بولتی ہے۔"

برہمو سماج کے لئے برہمو سنگیت لکھتے ہوئے رابندر ناتھ نے گیت لکھنا شروع کیا۔ مہرشی دیویندر ناتھ ٹھاکر کا تعلق برہمو سماج سے تھا اور وہ ۱۸۶۰ء میں برہمو سماج کے صدر ہوئے تھے برہمو سماج میں گیت گائے جاتے تھے جن کو "برہمو سنگیت" کا نام دیا گیا۔ مہرشی دیویندر ناتھ خود گیت کے متوالے تھے اس لئے جوڑا سانکو ٹھاکر گھرانہ گیت گانے والوں کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ اور اس گھر سے اس وقت کے نامور سنگیت کاروں کا تعلق تھا مثلاً جدو بھٹ، رادھیکا پرشاد گوسوامی

---

[1] تاریخ بنگلہ ادب۔ سکمار سین۔ ص ۵۴-۵۵۳۔

گوپیشور برجی، سریندر ناتھ برجی اور ندیا کے وشنو چکرورتی وغیرہ۔ ربندر ناتھ کو بچپن میں ان استاد کلاکاروں کے گیت سننے اور ان سے بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقعہ ملا۔ خود مہرشی دیویندر ناتھ نے بھی ربندر ناتھ کی ہمت افزائی کی ہے مہرشی خود برہمو سنگیت لکھا کرتے تھے اور گا کر سنانے کے لئے ربندر ناتھ بھی بلائے جاتے تھے۔ پچھلے صفحات میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ ۱۸۸۶ء میں مہرشی دیویندر ناتھ اپنے لائق فرزند سے برہمو سنگیت سن کر نہایت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے پانچ سو روپیہ ربندر ناتھ کو انعام دیا تھا۔ جب گھر کا یہ حال ہو اور گھر کے بڑے اس طرح ہمت افزائی کریں تو پھر سنگیت کی دنیا میں آگے بڑھنے کا شوق کیوں نہ پیدا ہو۔

اس کے بعد جب اپنی آبائی زمینداری کے سلسلے میں ربندر ناتھ کو شلائی داہ جانے اور دیہی علاقوں میں گھومنے کا موقع ملا تب وہ دیہی بنگال کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ لالن فقیر سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ بہرحال ملاقات ہوئی یا نہ ہو وہ لالن کے گیتوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے باؤل سنگیت سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ پھر شانتی نکیتن آشرم میں بھی ان کو گیت لکھنے اور گانے کا بہترین ماحول ملا۔ یہاں انہوں نے اس علاقے کے آدی باسی یعنی سنتالی گیت اور رقص سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے برسوں بعد جب انہوں نے یورپ اور امریکا وغیرہ کا بار بار سفر کیا اور سنگیت کی محفلوں میں شریک ہوئے تو مختلف ممالک کی موسیقی اور گیتوں کے سلسلے میں جانا اور ان ملکوں کو ہندستانی سنگیت سے آگاہ کیا۔ ٹھاکر مختلف ممالک کے سنگیت سے کتنے متاثر ہوئے اور خود انہوں ہندستانی سنگیت کلا سے دنیا کو کس طرح متاثر کیا وہ ایک الگ موضوع ہے جس پر لکھنے کے لئے کئی صفحات درکار ہیں۔ بہرحال جب ٹھاکر نے روح بنگال کو جانا، بنگال کی مٹی سے قریب ہوئے تو وہ بنگال کے دیہی گیتوں کی طرف جھکے انہوں نے کلاسکی راگ راگنیوں اور دیہی باؤل اور بھٹیالی اور دیگر لوک گیتوں کو نہایت ماہرانہ طور پر اپنے لئے گیتوں کی ایک دنیا بسائی۔ ٹھاکر کے گیتوں کے سلسلے میں ڈاکٹر ارنالڈ (Arnold A. Bake) نے لکھا ہے[۱]۔

---

[۱] Indian Music and Rabindernath Tagore.
By Arnold A. Bake London. 1930

"یہ قابل غور ہے کہ کس طرح ٹھاکر میں تینوں بہتے دھارے، مغربی موسیقی
کلاسیکی موسیقی اور لوک موسیقی گلے ملے اور کس طرح مغربی اور کلاسیکی
موسیقی رفتہ رفتہ لوک موسیقی میں ضم ہو گئی۔ چینے تنیہ کے دور سے قدیم
بنگلہ ویشنوی شاعری اور سب سے بڑھ کر رواں دواں لوک موسیقی
نے ان کے فن کو جلا بخشی اور اسے ایک خالص ہندستانی موسیقی میں
ڈھال دیا۔"

لارڈ کرزن کے تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) کے خلاف پورے بنگال میں زبردست بیداری پیدا ہوئی تھی ان دنوں تقسیم بنگال کے خلاف جو تحریک چلی اس میں رابندر ناتھ نے کھل کر حصہ لیا بنگال بھر میں سینکڑوں جلسے ہو رہے تھے اور بے شمار گیت کار گیت لکھ رہے تھے اس طرح ہزاروں گیت لکھے گئے جو سودیشی گیت کہے جاتے ہیں لیکن سب سے زیادہ سودیشی گیت رابندر ناتھ نے لکھے اور نہ صرف ان کے کئی گیت اُن دنوں مقبول ہوئے بلکہ آج بھی تقریباً اسّی (۸۰) سال بعد ان میں سے کئی گیت مقبول عام ہیں۔ ان گیتوں میں حبُ الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لیکن ٹھاکر کے یہ گیت حالانکہ بنگال کو سامنے رکھ کر ایک وقتی تحریک کے تحت وجود میں آئے تھے۔ پھر بھی سب کے سب گیت محض بنگال کے نہیں ہیں صرف چند مشہور گیتوں کا تعلق بنگال کی سرزمین سے ہے۔ مثلاً:۔

(۱) بنگال کی مٹی، بنگال کا پانی
(۲) میرا سنہرا بنگال، مجھے تم سے محبت ہے

ان گیتوں میں علاقائیت ہے لیکن کئی گیت ایسے ہیں جو پورے ہندستان کے لیے ہیں مثلاً:۔

(۱) اے میرے ملک کی مٹی، تجھے میرا سلام
(۲) میرا جنم سپھل ہے کہ میں اس دیش میں پیدا ہوا

اور پھر

(۳) "جن گن من ادھی نائک جئے ہے ــــــ" جو آج ہمارا قومی ترانہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہندستان ایک ایسا عظیم ملک ہے جس میں کئی علاقائی زبانیں ہیں اور

اور یہاں کے گیت کسی نہ کسی علاقائی زبان میں ہوں گے اور ان میں علاقائی خصوصیات ہوں گی یہی وجہ ہے کہ سودیشی تحریک کے سلسلے میں رابندر ناتھ نے جو سینکڑوں گیت لکھے ان میں جن گیتوں کا تعلق پورے ہندستان سے ہے وہ بھی کل ہند پیمانے پر (علاقائی زبان میں ہونے کی وجہ سے) پھیل نہیں سکے پھر دیش بھکتی کے ان سودیشی گیتوں میں وہ گیت بھی شامل ہیں جن سے قومی شعور ابھرا، جن گیتوں نے تحریک آزادی کو آگے بڑھایا۔ مثلا

(۱) اگر تیری آواز پر کوئی لبیک نہ کہے
تو ــــ تُو ــــ اکیلا چل، اکیلا چل، اکیلا چل

(۲) ترے اپنے بھی تجھے چھوڑ جائیں گے
اس لئے تو کوئی فکر نہ کر

(۳) آگے چل، آگے چل، بھائی

(۴) چھی چھی ــــ آنسوؤں سے زمین کو تر نہ کر

(۵) اب اور دیر نہیں
ہاتھ سے ہاتھ ملاؤ

(۶) تیز ہوائیں چل رہی ہیں
اطراف سے بادل گھر آئے ہیں

رابندر ناتھ کبھی کسی سلسلے میں تنگ نظر نہیں تھے۔ اس کی مثال اُن کے گیتوں میں بھی پائی جاتی ہے اس دور کی سیاست میں وسعت کی کمی ضرور تھی چونکہ اس وقت تک سیاست سے عوام کا تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ خاص کر کسان اور مزدور سیاست سے دور تھے۔ سیاست سے عموماً کھاتے پیتے گھروں کے لوگ ہی دلچسپی رکھتے تھے اور کہا بھی یہی جاتا تھا کہ سیاست میں حصہ لینا غریبوں کا کام نہیں ہے لہذا کھاتے پیتے گھروں تک سیاسی سرگرمیاں محدود تھیں۔ اس طبقہ نے دیش کو "ماں" کا روپ دیا۔ اور ایک دیوی کے طور پر اسے پیش کیا۔ متوسط

طبقہ میں ہندو ہی زیادہ پڑھے لکھے تھے لہٰذا تحریک آزادی میں "دیوی مادر وطن" کی جو تصویر ابھری اس کا تعلق ہندو تہذیب سے زیادہ رہا ہے اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ رابندر ناتھ نے جو سینکڑوں دھارمک گیت لکھے وہ محض ہندوؤں کے لئے نہیں، اور وہ مادر وطن کو ایک "دیوی" کی طرح پیش کرنے کے بھی خلاف رہے حتیٰ کہ ان کے بھکتی گیتوں میں ہم کسی خاص دیوی یا دیوتا کا تصور نہیں پاتے ہیں اور نہ ہی وہ "شکتی پوجا" کے طرفدار تھے۔ اس کی وجہ ان کا برہمو سماج ہونا بھی ہو سکتا ہے انہوں نے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے پولین سین کے نام لکھا:-

"ایک دن میرے مرحوم دوست ہیم چندر ملک، شری بپن پال کے ساتھ
آئے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں خاص طور پر درگا دیوی کے ساتھ
مادر وطن کی دیوی کو ملا کر ان کے درگا پوجا کے موقعہ پر ہونے والے
جلسے کے لئے دیش بھکتی کے موضوع پر ایک گیت لکھوں ...... میں نے
اسے تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ ایسی بھکتی کا میں قائل نہیں ہوں اور
میرے لئے ایسا کرنا ناانصافی ہوگی۔"

یوں تو ٹھاکر کے گیت ان کے کئی مجموعۂ کلام میں بھی شامل ہیں۔ اور کئی ڈراموں میں بھی گیت ہیں لیکن "گیتانجلی، گیت مالیہ اور گیتالی" جو ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۴ء کے درمیان شائع ہوئے ان کے گیتوں کے تین اہم مجموعے ہیں اور ان تینوں کا موضوع بھی یکساں ہے یعنی یہ سب بھکتی گیت ہیں۔ ٹھاکر نے مختلف موسموں سے متعلق بھی گیت لکھے اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے بچوں کے لئے بھی گیت لکھے۔ غالباً ٹھاکر کے علاوہ آج تک کسی اور فنکار نے بچوں کے گانے کے لائق گیت نہیں لکھے۔ ان کے یہ گیت نہایت آسان زبان میں ہیں جو بچے آسانی سے ادا کر سکتے ہیں حالانکہ انہوں نے کیا خوب کہا ہے:-

"تم مجھے سہل لکھنا کہتے ہو
سہل لکھنا، سہل کام نہیں"

مختصر یہ کہ بنگال کے لوگ جو گیتوں کے متوالے ہیں ان کو ٹھاکر نے سینکڑوں گیت دیئے اور پہلی بار کلاسیکی سنگیت جو صرف راجاؤں یا رئیسوں کے درباروں یا محفلوں تک

محدود تھا۔ ان کو بنگال کے لوک گیتوں سے ملا کر رابندر ناتھ نے عوام کے لئے گیت رکھے اور ان گیتوں کو سُر دے کر ہندستانی سنگیت میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ربندر سنگیت، ٹھاکر کی زندگی ہی میں مقبول ہو گئے تھے۔ صرف بنگال میں نہیں بلکہ پورے ہندستان اور ہندستان کے باہر دیگر ممالک میں بھی۔ انگریزی میں ترجمہ ہو کر ربندر سنگیت یورپی ممالک میں پہنچ گئے اور ربندر سنگیت کے فن کو جاننے کے لئے غیر ممالک سے کئی لوگ شانتی نکیتن میں بنگلہ زبان کی تعلیم حاصل کرنے بھی آتے رہے اس سلسلے میں ارنالڈ بیاک (Arnold A. Bake) کا نام خاص طور پر لینا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ برزو (G.K. Brezzo) وہ فنکار ہیں جنہوں نے کئی ربندر سنگیت کا انگریزی ترجمہ کیا اور اُن گیتوں کو سُر دیا اس سلسلے میں مس یسوچین بولز، اور مس وکٹوریہ کنگسلی کے نام بھی اہم ہیں جو عرصہ تک شانتی نکیتن میں ربندر سنگیت کی تعلیم پاتے رہے۔

③ افسانے اور ناولیں

کئی قلم کاروں نے ربندر ناتھ کو بنگلہ افسانے کا موجد قرار دیا ہے۔ لیکن تحقیق کی روشنی میں یہ درست نہیں ہے بنگلہ زبان کا پہلا افسانہ "مدھومتی" جو شری پورہ کی تخلیق ہے ماہنامہ "بنگ درشن" ۱۲۸۰ بنگلہ سن مطابق ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کے بعد چند افسانے شائع ہوئے لیکن بطور ایک افسانہ نگار کے بنگلہ ادب میں کوئی فرد واحد ابھر کر رابندر ناتھ سے پہلے نہیں آسکا ہے لہذا رابندر ناتھ بنگلہ زبان کے پہلا تسلیم شدہ افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔

رابندر ناتھ نے اس جدید فن کو اتنی ترقی دی کہ آج کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ افسانہ نگار، تقریباً ایک صدی کے طویل سفر کے بعد بھی ٹھاکر کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ناول میں جس طرح مکمل طور پر کرداروں کو ابھار کر پیش کیا جاسکتا ہے جس طرح زندگی کو ایک وسیع میدان میں دکھایا جاسکتا ہے۔ اس طرح افسانہ زندگی کی مکمل کہانی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل، معمولی مسائل اڑتے ہوئے لمحات کسی ایک خیال یا جذبے کا ترجمان ہوتا ہے۔ رابندر ناتھ کے الفاظ میں ایک ذرا لمس، صرف چھو لینا، ایک افسانے کی تخلیق کے لئے کافی ہے۔ ٹھاکر نے زندگی کے ایسے ہی لمحوں کو، چھوٹے چھوٹے واقعات کو، ایک ایک لمس کو، چھوٹی سی بات کو، ٹکڑے ٹکڑے

ادھورے اور بکھرے خیالات کو، وقتی جذبات کو، اپنے افسانوں میں سمولیا۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ کسی افسانے کے مرکزی خیال کو بعد میں انہوں نے کسی ناول میں وسعت دی اور پھر ایسا بھی ہوا کہ کسی ناول کو بعد میں انہوں نے ڈرامے کی شکل دے کر اسٹیج پر پیش کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ بار بار وہ اپنی تخلیقات میں کاٹ چھانٹ کرتے رہے، تبدیلیاں کرتے رہے لہذا ان کی زندگی میں ان کی تخلیقات (خاص کر ڈرامے) کے جو نئے ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں ان میں ہم بے شمار تبدیلیاں پاتے ہیں۔ رابندر ناتھ سے پہلے بنگلہ ادب میں فن ناول نگاری نے ایک روپ پالیا تھا۔ اور بنکم چٹرجی نے تاریخی ناول نگاری کو ایک شکل دی تھی۔ ٹھاکر کے ابتدائی ناولوں پر بھی بنکم چٹرجی کے اثرات ہیں۔

ناولیں ہوں یا افسانے رابندر ناتھ نے ہمیں جو نئی چیز دی ہے وہ عام لوگوں کا ذکر ہے۔ ٹھاکر سے پہلے ہم ناولوں اور افسانوں میں زمیندار پاتے ہیں، رئیس پاتے ہیں، راجے مہاراجے پاتے ہیں لیکن کہیں کوئی عام آدمی کا کردار ابھر کر نہیں آتا۔ کسی کسان یا مزدور کا ذکر نہیں آتا۔ ٹھاکر نے ہمیں ایسے لوگوں کی زندگی سے پہلی بار آگاہ کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے یہ نچلے طبقہ کے لوگ بنگلہ ادب میں ابھر آئے۔ ٹھاکر نے ان لوگوں کو "پندرہ آنے والے" کہا ہے یعنی ایک روپیہ، جو ان دنوں سولہ آنے کا ہوتا تھا ان میں یہ لوگ ہی "پندرہ آنے" کے برابر ہیں۔ یعنی یہ کہ سماج میں ان کی بھاری بھرکم اکثریت ہے۔ ٹھاکر نے بتایا کہ اب وقت آگیا ہے "پندرہ آنے" والوں کا ساتھ دینے کے لئے، اور اپنے اجاگر کرنا چاہئے کہ "ایک آنہ" والے کس طرح "پندرہ آنہ" والوں پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں یعنی ٹھاکر نے بتایا کہ محض کسی عام آدمی کو لانا ہی ترقی پسندی نہیں ہے بلکہ ترقی پسندی اس میں پوشیدہ ہے کہ کس طرح اسے پیش کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے دو کسانوں میں کسی کھیت کے بٹوارے پر جھگڑا ہوجائے۔ اور ایک دوسرے کو قتل بھی کردے۔ اگر کہانی کا پلاٹ یہی ہے تو وہ، کسانوں کو پیش کرنا تو ہوا، لیکن یہ کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے کیوں کہ یہ ایک کسان گھرانے کا بالکل نجی یا انفرادی معاملہ ہے۔ یہ دونوں لڑنے والے سماج کے مظلوم طبقہ کے فرد ہیں۔ لہذا اس میں کوئی طبقاتی کشمکش نہیں ہے۔ ایسی آپسی دشمنی سے تو بڑا دشمن یعنی زمیندار ہی فائدہ مند ہوتا ہے بڑے لوگ

تو غریبوں کو آپس میں لڑا کر ہی اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں جس طرح ایک مفاد پرست حکومت عوام کے مختلف طبقے میں اختلافات کو پروان چڑھا کر آرام سے حکومت کرتی ہے لیکن اگر کوئی معمولی کسان، زمیندار کے مظالم کے خلاف لڑتا ہے اور دوسرے کسانوں کو بھی اس لڑائی میں شامل کرتا ہے تو وہ اپنے وطن کے لئے قربانی دیتا ہے چاہے اس کی قربانی کی شکل کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ مگر اس میں ایک مقصد ہے۔ اس قربانی کی قدر و قیمت ہے اور اس جذبہ قربانی کو اجاگر کرنا ہی فنکار کے سماجی شعور کی دلیل ہے رابندر ناتھ کی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے ایسی قربانیوں کو اجاگر کیا ہے۔

شری الّو لوتے چٹوپادھیائے نے ٹھاکر کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۸۹۱ء سے ان کی کہانیاں بنگلہ ہفتہ وار "ہیتوبادھی" میں شائع ہونے لگیں تھیں۔[1] لیکن اس بیان سے اگر یہ سمجھا جائے کہ ۱۸۹۱ء سے قبل ٹھاکر نے افسانے نہیں لکھے تو غلط ہوگا۔ رابندر ناتھ نے ۸۵-۱۸۸۴ء (بنگلہ سن ۱۲۹۱) سے افسانے لکھنا شروع کیا اور ان کا پہلا افسانہ گھاٹیر کتھا (گھاٹ کی بات) ماہنامہ "بھارتی" ماہ کارتک کے شمارے میں شائع ہوا۔[2] لیکن جیسا کہ شری کمار بندوپادھیائے نے لکھا ہے۔[3] ۱۸۹۱ء سے قبل کا دور ٹھاکر کے ابتدائے عشق کا زمانہ رہا ہے اور بطور افسانہ نگار ان کا پہلا دور ۱۸۹۱ء تا ۱۹۱۷ء ہے اس کے بعد وہ مکمل آٹھ سال تک افسانوں کی دنیا سے دور رہے اور پھر ۱۹۲۵ء سے افسانے لکھنے لگے اور آخر دنوں تک وہ اس میدان میں شاعری، گیت، مصوری، مضامین اور ناول نگاری کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

رابندر ناتھ کے افسانوں کو الّو لوتے چٹوپادھیائے نے تین دور میں تقسیم کیا ہے پہلا دور ۱۹۰۱ء تک جس دور میں انہوں نے ۶۵ افسانے لکھے۔ دوسرا ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء

---

[1] ہفتہ وار "پچھم بنگہ" ٹھاکر نمبر ۹ مئی ۱۹۸۰ء ص ۹۴۵

[2] ماہنامہ "بھارت ورش" مضمون از بھبانی مکھوپادھیائے۔ بنگلہ سن ۱۳۴۸ مطابق ۱۹۴۱ء ص ۴۲۲

[3] رابندر سمرتی۔ مرتب وشوناتھ دے۔ ۱۹۶۱ء ص ۱۴۱

تک اور تیسرا ۱۹۲۵ء کے بعد کے افسانے۔ پہلے دور کے افسانوں کا موضوع عموماً گھریلو مسائل ہیں لیکن اس دور کے دو افسانے نہایت مشہور ہوئے اور یہ افسانے ٹھاکر کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں مثلاً "پوسٹ ماسٹر" اور ٹیگور کا بین الاقوامی شہرت یافتہ افسانہ "کابلی والا" — "کابلی والا" کا شمار دنیا کے بہترین کہانیوں میں کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں نہ صرف پدری محبت کو اجاگر کیا گیا ہے بلکہ یہ افسانہ ملک کی سرحدوں کو، مذہب اور رنگ و نسل کے بندھنوں کو توڑ کر یہ بتاتا ہے کہ جذبہ محبت لامحدود اور عالمگیر ہے۔ انسان ہر ملک میں ہے اور اس انسان کے دل میں محبت ہے۔ یہ افسانہ آج بھی ہند اور افغانستان کے درمیان محبت کی ایک نشانی ہے ایسا عظیم افسانہ رابندر ناتھ جیسا عظیم فنکار ہی تخلیق کر سکتا تھا۔ "ایک رات، مہامایا، درشٹی دان، مالیہ دان، مان بھنجن، ادھیاپک، ششیر راتری" وغیرہ بھی کامیاب افسانے ہیں۔ پہلے دور کے افسانوں میں قدرتی مناظر کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ افسانے دیہی بنگال، دریائے پدما کے کنارے کنارے دیہاتوں کے مناظر پیش کرتے ہیں چونکہ ان دنوں رابندر ناتھ شلائی دا کے دیہی علاقوں میں تھے ان افسانوں میں گاؤں کے لوگوں کی زندگی، ان کے مسائل، ان کی سادگی، ان کا دکھ درد، سب کچھ بالکل فطری طور پر آیا ہے۔

"کھودی نہ پاشان"، "بھوکے پتھر"، "نشی تھے" (رات میں)، "منی ہار" — جیسے افسانے کو بعض نقادوں نے بھوتوں یا روحوں کی کہانیاں قرار دیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ افسانے بھوتوں کے سلسلے میں نہیں ہیں اور غالباً ٹھاکر بھوتوں کے قائل بھی نہیں تھے۔ کبھی کبھی کسی فرد کے دل و دماغ پر کوئی گہرا نقش کسی خاص وجہ سے جم جاتا ہے کہ ایک خیال دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور وہ خیال اسے پریشان کرتا ہے وہ خیال بار بار ابھر آتا ہے، وہ خیال سے باتیں کرتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے جو عام حالات کے تحت کوئی آدمی نہیں کرتا یعنی ایک طرح سے دماغی کمزوری کی علامت ہے اس قسم کے کامیاب افسانے لکھنا نہایت دشوار کام ہے۔ ادب اور مصوری میں فنکار کی اس ذہنی کیفیت کو "سرریلزم" Sure Realism کہتے ہیں اور یہ بذات خود ایک بڑی فنکاری ہے۔

"کھودی تہ پاشان" جیسا کامیاب افسانہ رابندر ناتھ کے بعد اور کوئی لکھنے میں کم از کم بنگلہ ادب میں کامیاب نہیں ہوا۔ ایسے افسانے لکھنے کے لئے اس ڈھنگ کا بین الاقوامی شہرت یافتہ افسانہ نگار کو تیرتھ کو بھی غیر فطری طور پر سنسان گھنے جنگل اور روحوں کی دنیا بسانی پڑی لیکن رابندر ناتھ نے نہایت کامیابی اور فنکاری سے ایک محل کی چار دیواری میں ایسا ماحول پیدا کر لیا۔ افسانہ "نشی تھے" بھی اسی ڈھنگ کا افسانہ ہے پہلی بیوی سے شوہر نے جو جو ناانصافیاں کی تھیں وہ ناانصافیاں شوہر کے دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ہیں اسے بار بار اپنی ناانصافیوں کا خیال ستاتا ہے۔ بستر مرگ پر پڑی پہلی بیوی جو بار بار اپنے شوہر سے سوال کرتی تھی ــــ "وہ کون ہے، کون ہے، کون ہے وہ"۔ یہی سوال شوہر کے دل پر نقش بن کر رہ جاتا ہے اور یہی سوال اسے ہمیشہ پریشان کرتا ہے ــــ افسانہ "منی ہار" پڑھنے کے بعد دیر تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "میں جاگ رہا تھا۔ یا خواب دیکھ رہا تھا" ــــ "کھودی تہ پاشان" اور "نشی تھے" کی طرح یہ بھی ایک شوہر کی کہانی ہے ان افسانوں کی زبان خاص کر "کھودی تہ پاشان" کی زبان، انداز بیان اور ماحول کی عکاسی اور اس کا ہر ہر لفظ ایک ایسا ماحول پیدا کرتا ہے جو ایک عظیم فنکار ہی پیدا کر سکتا ہے۔

دوسرے دور کے افسانوں میں "بیوی کا خط"، پہلا نمبر، سبھاپتی، میگھ و ردّر ماسٹرجی، راشن مینی کا بیٹا، ٹھاکردا، اور "مالدار گھرانہ اہم ہیں"۔ اس دور کے بیشتر افسانوں کا تعلق شہری زندگی سے ہے۔ اس عہد میں سیاست کو آج کی طرح اہمیت حاصل نہیں تھی پھر بھی ٹھاکر کے کئی افسانوں میں ان دنوں کی سیاسی کشمکش صاف ملتی ہے مثلاً ایک رات، میگھ و ردو، راج ٹیکا، دھنگشا، سنسکار بدنام، شیش کتھا" وغیرہ "بیوی کا خط" کا موضوع سیاست نہیں ہے لیکن اس میں بھی سماجی اور سیاسی مسائل آہی گئے ہیں۔ انگریز مخالف شرت، عورت ذات کی بے عزتی کو برداشت نہیں کر پاتا ہے جب کہ گھر کے دیگر افراد سماج کی قدامت پسندی کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور وہ لوگ صاحب لوگوں (انگریزوں) کی خوشامد بھی کرتے ہیں۔ دھنگشا، (تباہی) کا پس منظر دوسری جنگ عظیم ہے جس میں جنگ سے ہونے والی تباہی و بربادی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے جنگ کے خلاف نفرت کا جذبہ

ابھرتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں لکھا ہوا افسانہ "سنسکار" میں غیر ملکی سامان کا بائی کاٹ اور ہریجن لوگوں کو سماج میں مقام دینے کی وکالت کی گئی ہے۔ افسانوں کا مجموعہ "لی پی کا" کا افسانہ "بی درشک" جو قدیم بادشاہی عہد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس میں سامراجیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بی درشک کہتا ہے ــــ میں مر بھی نہیں سکتا اور قتل وخون بھی نہیں کر سکتا۔ بھگوان کی کرپا سے میں صرف ہنس سکتا ہوں لیکن اگر میں مہاراجہ کے دربار میں رہا، ان کی محفلوں میں رہا، تو میں اپنی ہنسی بھول جاؤں گا مسکرانا بھول جاؤں گا۔ سامراج کے لالچ میں راجا ہنسی کا خون کر رہا ہے ــــ "درشا" تاریخی رومانی افسانہ ہے اس کے باوجود اس میں سیاست شامل ہے کیوں کہ اس میں سپاہیوں کی بغاوت (غدر) کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ ٹھاکر کے دور کے بنگالی دانشوروں نے غدر کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایسی حالت میں ۱۸۹۸ء میں ٹھاکر نے اس افسانے میں بغاوت کو جو اہمیت دی ہے وہ نہایت اہم اور قابل قدر جذبہ ہے۔ افسانے کا ایک اور کردار کیشرلال کہتا ہے "اب گائے کھانے والے گوروں کو ہندستان سے دور کر کے پھر سے ایک اور بار ہندو مسلمان کو شاہی تخت پر بٹھانا ہوگا۔" ٹھاکر کے اسی افسانے پر روشنی ڈالتے ہوئے اور کیشرلال کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے شری کھیتر گپت نے لکھا ــــ "اس عہد کے بنگالی دانشوروں کے مقابلے ربندرناتھ کے افسانوں میں تاریخی شعور بہت زیادہ واضح اور فکر انگیز ہے[۵]" ــــ میگھ ورودّر، نامنظور، "اور شیش کتھا" کے ہیرو انقلابی ہیں، باغی ہیں، یہ باغی انفرادی طور پر بغاوت کرتے ہیں کسی انگریز کا خون کرنا یا کسی پولیس کا خون کرنا ان کا کام ہے۔ ٹھاکر نے ایسے باغیوں کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کی بغاوت سے آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے لیکن ٹھاکر بغاوت کے خلاف نہیں ہیں وہ انفرادی ہیرو پرستی اور دہشت پسندی کی تائید نہیں کرتے چونکہ ان کے خیال سے اس راستے پر چل کر آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن وہ ایسے باغیوں کے دلی جذبات کی قدر کرتے ہیں اور بغاوت کے جذبے کو عوام میں بیدار کرنے پر زور

---

۵ بنگلہ ہفتہ وار "پچھم بنگ" ٹھاکر نمبر ۱۵ رمئی ۱۹۸۵ء ص ۱۰۵۳

دیتے ہیں۔ تحریک کی ضرورت کو واضح کرتے ہیں۔ ان کے مذکورہ افسانوں سے یہ بھی نمایاں واضح ہو جاتا ہے کہ "تحریک" سے ان کا مطلب "اہنسا یا عدم تشدد" نہیں ہے۔ وہ ضرورت پڑنے پر "ہنسا" یا "تشدد" کے قائل تھے۔ لیکن یہ تشدد ایک منتظم تحریک کی شکل میں ہو یعنی ہتھیار بند عوامی جنگ ہو۔ کم از کم ان کا افسانہ "بدنام" سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

رابندر ناتھ نے کتنے افسانے لکھے کہا نہیں جا سکتا۔ سکمار سین نے لکھا ہے کہ "ان کے افسانوں میں تعداد لگ بھگ ایک سو ہے۔"[1] لفظ "لگ بھگ" سے صاف ہے کہ انہوں نے صرف ایک اندازہ لگایا ہے لیکن یہ اندازہ درست نہیں ہے۔ افسانوں کے مجموعے "گلپا گوچھ" (مختلف حصے) اور مجموعہ "تین سنگی" میں ۹۳ کہانیاں ہیں اور "لی پی کا" سے اور "گلپا سلپا" میں ۵۲ افسانے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کی تعداد ۱۴۵ ہوتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ چند اور افسانے بھی ہوں۔ جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے۔ بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹھاکر نے ۱۵۰ کے قریب افسانے لکھے ہیں۔

رابندر ناتھ کے ناولوں کی تعداد (جو کتابی طور پر شائع ہوئے) ۱۳ ہیں۔ انہوں نے شاعری اور ناول نگاری تقریباً ساتھ شروع کی تھی۔ ان کا پہلا ناول "کرونا" قسط وار رسالہ "بھارتی" میں بنگلہ سن ۱۲۸۴ مطابق ۱۸۷۷ء شائع ہوا لیکن غالباً یہ مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ لہذا کتابی طور پر یہ ناول شائع نہیں ہوا۔ اس کے بعد اس رسالے میں "بو ٹھاکرانیر ہاٹ" (۱۸۸۱ء) شائع ہوا۔ یہ دونوں تاریخی ناولیں ہیں اور ان پر ناول نگار بنکم چٹرجی کا نمایاں اثر ہے لیکن ٹھاکر نے اس کے بعد ہی اپنی راہ الگ نکال لی۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ تاریخی ناولیں، تاریخ نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ناول کی ضرورت کے مطابق تاریخ کو محض پس منظر کے طور پر کام میں لایا جاتا ہے اس طرح یہ ناولیں جشور یا ترپورہ کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ "راجرشی" کے بعد طویل سات سال تک رابندر ناتھ نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا قدم "چوکھیر بالی" (۱۹۰۲ء) اور "نوکاڈوبی" (۱۹۰۶ء) آتے ہیں لیکن یہ ناولیں بھی ایسی نہیں ہیں جن کا خاص طور پر ذکر کیا جائے

---

[1] "تاریخ بنگلہ ادب"۔ سکمار سین ص ۵۶۵

بلکہ کئی نقادوں کا خیال ہے کہ "نوکاڈوبی" ربندر ناتھ کا سب سے کمزور ناول ہے۔

ربندر ناتھ کے ناولوں میں "گھرے بائرے" (۱۹۱۶ء) "چتورنگ" (۱۹۱۶ء) "جوگا جوگ" (۱۹۲۹ء) اور "شیشر کوبیتا" (۱۹۳۰ء) ایسے ہیں جو مقبول ہوئے۔ "گھرے بائرے" اور "چار ادھیائے" (۱۹۳۴ء) دونوں کا موضوع دہشت پسند بغاوت کی تحریک ہے۔ "جوگا جوگ" ایک نامکمل ناول ہے۔

ٹھاکر کے تمام ناولوں میں "گورا" سب سے ضخیم اور اہم ترین ناول ہے جس کے لئے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ "گورا" کی تخلیق کا زمانہ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۱ء ہے۔ "گورا" کی طرح ایک مکمل ناول جو اپنے سماج اور وقت کا ہر لحاظ سے بھرپور ترجمان ہو، غالباً ہندستانی ادب میں آج تک نہیں لکھا گیا۔ "گورا ہر لحاظ سے ایک عظیم کردار ہے۔ محب وطن، مظلوموں کا ساتھی ظلم کے خلاف جہاد کرنے والا، انسانیت کا پجاری، بیباک اور نڈر سپاہی، ہندو مسلم اور دیگر تمام مذاہب کے اتحاد کا ایک اچھوتا نمونہ، آزادی کا متوالا، انسان دوست ـــــ "گورا" کی یعنی ہیرو گورا کی پیدائش غدر کے زمانے (۵۸ - ۱۸۵۷ء) میں ہوئی۔ وہ جب ۲۲، ۲۳ برس کا جوان ہوا تب تک کانگریس کا جنم نہیں ہوا تھا۔ یعنی کردار گورا سے گورا کو تخلیق کرنے والا فنکار ٹھاکر صرف تین چار سال کا چھوٹا رہا ہے۔ گورا کے مطالعہ سے واضح ہے کہ ربندر ناتھ نے اس کی کہانی میں اپنے سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور کو بھرپور استعمال کیا ہے اور اپنے ذاتی تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورا ان کا کامیاب ترین ناول ہے۔ بنگلہ ناول نگاری کے میدان میں گورا ہی پہلا کردار ہے جو غریب کسانوں کا ساتھی ہے جو کسانوں کے حق کے لئے انگریزی حکومت سے ٹکر لیتا ہے حتیٰ کہ ایک پولیس کو مار کر ایک ماہ جیل کی سزا تک پاتا ہے۔

آج ہم فخر سے بنگلہ افسانے اور ناولوں کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ بنگلہ زبان میں کئی ایسی کہانیاں اور کم از کم ایک ناول ہے جس کا شمار دنیا کے بہترین افسانوں اور ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس فخر کو حاصل کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ربندر ناتھ کا ہے۔ شری دیپن رناتھ بندوپادھیائے

نے لکھا ہے ــــــ "افسانوں کی دنیا میں ربندر ناتھ سے تعلیم حاصل کرکے آج آخرکار ہم ان سے آگے نکل جا سکے ہیں۔ لیکن ناول کے میدان میں آج بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ لہٰذا "گورا" آج تک بنگلہ زبان کا بہترین ناول ہے ــــــ"[1] بہرحال دنیائے افسانہ اور ناول میں ربندر ناتھ نے بنگلہ ادب کا سر اتنا بلند کر دیا کہ ان کا مقابلہ دنیا کے دیگر عظیم فنکاروں مثلاً موپاساں، ایلن پو، چیکوف، ٹالسٹائی، اور گورکی وغیرہ سے ہم فخر کے ساتھ کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔

---

[1] ہفتہ وار "پچھم بنگہ" ٹھاکر نمبر، ۱۹ مئی ۱۹۷۸ء کلکتہ۔

ٹیگور ۲۱ سال کی عمر میں اپنے ایک ڈراما میں "بالمکی" کی حیثیت سے
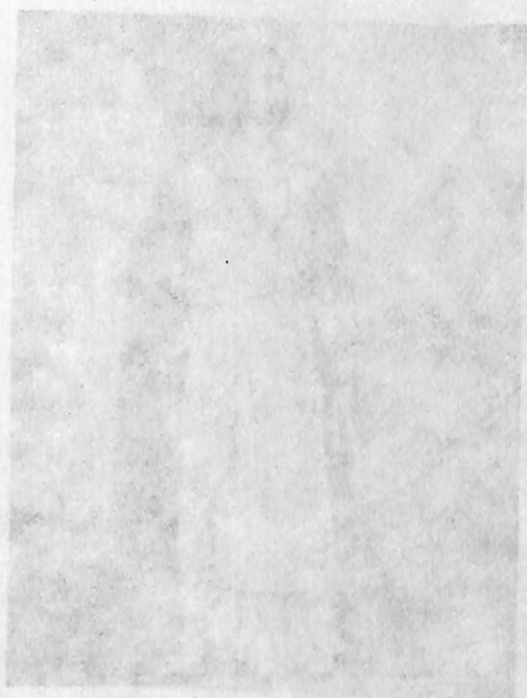
(۴) ڈرامے

پڑھنے سے زیادہ لوگ اپنی آنکھوں سے کسی چیز کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں اور جب کسی دیکھنے کی چیز میں دل کو اپنی طرف کھینچ لینے کی صلاحیتیں بھی ہوں تو وہ چیز بہت طویل عرصہ تک اور کبھی کبھی عمر بھر کے لئے دل و دماغ پر نقش بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے ٹھاکر ڈراموں سے عمر بھر دلچسپی لیتے رہے اور آخری عمر میں تو انہوں نے پردۂ فلم سے بھی اسی بنا پر دلچسپی لی تھی۔ "رابندرناتھ اور فلم" بھی اسی لحاظ سے بحث کا ایک دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے لیکن آج میں پردۂ فلم نہیں بلکہ اسٹیج تک اپنے موضوع کو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ ورنہ بات سے بات نکلتی جائے گی اور بہت دور تک چلی جائے گی۔

ٹھاکر نے جو ناٹک لکھے وہ محض کتابی شکل میں شائع کرنے کے لئے نہیں لکھے بلکہ ہر ڈرامہ نگار کی طرح ان کا مقصد بھی اسٹیج پر ان ڈراموں کو پیش کرنا رہا ہے۔ جوڑاسانکو ٹھاکر گھرانے کا ماحول ہی ایسا تھا جس میں رابندرناتھ کو لڑکپن ہی سے ڈراموں سے خاص دلچسپی ہو گئی تھی رابندرناتھ کے دادا پرنس دوارکاناتھ ٹھاکر کو بھی ڈراموں سے دلچسپی تھی۔ وہ "چورنگی تھیٹر" اور اس کے بعد ساں سوسی تھیٹر" کے بانیوں میں تھے۔ رابندرناتھ کے والد مہرشی دیویندرناتھ اور خاص کر چچا گیریندرناتھ کے دو بیٹے گگن یندرناتھ اور گیانندرناتھ ماہر اداکار تھے۔ ابنندرناتھ اور دین یندرناتھ کا نام بھی کامیاب اداروں میں لینا چاہیے۔ حالانکہ ابنندرناتھ بطور مصور کے

ہی نامور ہوئے لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ رابندر ناتھ سے بہتر اداکار رہتے۔ ٹھاکر گھرانوں میں جب ڈراموں کے لئے اسٹیج قائم ہوا اور گھر میں ڈرامے کھیلے جانے لگے تب رابندر ناتھ صرف چھ سات برس کے تھے۔ رابندر ناتھ کے ایک بڑے بھائی (پانچویں) جیوتی رابندر ناتھ، نہایت کامیاب ڈرامانگار اور اداکار تھے جن سے رابندر ناتھ بے حد متاثر ہوئے۔ سورن کماری دیوی بھی اچھی اداکارہ تھی۔ جس گھر کا یہ حال ہو، اس گھر کا پیدائشی فنکار رابندر ناتھ کیوں کر ڈراموں کی دنیا سے دور رہتا۔ رابندر ناتھ بھی ایک اچھے ڈرامانگار، اداکار اور ہدایت کار بنے اور لگ بھگ ساٹھ سال تک وہ ڈراما اور اسٹیج کی دنیا سے منسلک رہے۔

ٹھاکر نے اسٹیج کی ضرورت کے مدنظر اپنے ڈراموں میں بار بار تبدیلیاں کی ہیں، گیتوں کو، سُر کو، مکالموں کو، مناظر کو، لباس کو بار بار بدلا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہر بار کسی ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کرنے سے پہلے انہوں نے ازسرِنو اس پر نظرِ ثانی کی ہے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ ۲۶ فروری ۱۸۸۱ء یا جب وہ بیس برس کے تھے۔ جوڑا سانکو ٹھاکر گھرانے کے اسٹیج پر (جو تیسری منزل کی چھت پر بنایا گیا تھا) انہوں نے اپنا پہلا ڈراما "والمکی پرتی بھا" (بنگلہ تلفظ "بالمکی پرتی بھا") پیش کیا اور خود والمکی کا رول ادا کیا۔ اس ڈراما کے دیکھنے والوں میں وقت کے نامور لوگ شامل تھے مثلاً بنکم چندر چٹرجی، ہر پرشاد شاستری اور راج کشن وغیرہ۔

رابندر ناتھ فن کے ہر میدان میں ایک انقلابی بنے رہے! انہوں نے جس فن میں ہاتھ لگایا اس کی کایا پلٹ دی۔ ڈراموں کے سلسلے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ٹھاکر بنگلہ ناٹک کے بانی یا موجد نہیں ہیں۔ ٹھاکر سے قبل بنگلہ ناٹکوں کو دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں رام نرائن ترکارتن، مائیکل مدھو سودھن دت اور دین بندھو مترآتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بنگلہ ڈراموں کو سنسکرت کے نقشِ قدم کی پیروی سے آزادی دلائی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے ڈراموں کے ذریعہ سماج سدھار کا کام لیا۔ سماج کے فرسودہ رسموں کی مخالفت کی۔ ان سے قبل کے ناٹکوں کا موضوع محض مذہب تھا۔ رامائن اور مہابھارت کے مختلف کرداروں کو ناٹک میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن ان فنکاروں نے مذہب کی قید سے ناٹک کو آزادی بخشی۔ اس طرح ان کا یہ اقدام اپنے لحاظ سے سیکولر اور انقلابی رہا ہے۔

لیکن اس کے بعد کا دور جسے ہم دورِ دوم اور ربندر ناتھ سے پہلے کا دور قرار دیتے ہیں وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ جانے کا دور رہا ہے اس دور میں ناٹک کو ایک "سامان تجارت" بنا لیا گیا اور ناٹکوں میں مذہبی جذبات کو ابھار کر پیش کیا جانے لگا۔ مذہبی جذبات کو ابھار کر ایسے غلط اقدام کئے گئے، جس سے سماج میں ایک مذہب والوں کے دلوں میں دوسرے مذاہب والوں کے خلاف نفرت کے جذبے ابھرے اس طرح دورِ اول میں جو ترقی پسند خیالات پیش کئے گئے تھے اس پر پانی پھیر دیا گیا۔ اس کام کو گریش چند اور امرت لال کے کئی ناٹکوں نے انجام دیا۔ حتیٰ کہ آزادیِ نسواں کے خلاف بھی ڈرامے لکھے گئے۔

پھر گریش چند کے بعد ناٹکوں میں اور بھی زوال آیا۔ ان دنوں قومی بیداری کے نام پر جو تاریخی ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے گئے، ان سے سیکولر جذبات پر مزید ضرب پڑی چونکہ ان میں سے کئی ڈراموں میں ہندو مسلم جنگ کو موضوع بنایا گیا اور کسی ہندو راجا کو ہیرو کے طور پر پیش کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کا دشمن دکھایا گیا۔ اس قسم کے بیشتر ڈراموں کو جن کو تاریخی ڈراموں کے نام پر اسٹیج کیا گیا کا تاریخ سے برائے نام ہی کوئی تعلق رہا ہے اس قسم کے ڈراموں سے ڈراما اسٹیج کرنے والوں کو مالی فائدہ ضرور ہوا۔ لیکن قومی اتحاد کو اس سے نقصان پہنچا۔

بنگلہ ڈراموں کے ایسے دورِ زوال کے دنوں ایک باد مخالف بن کر ربندر ناتھ نے اس میدان میں قدم رکھا انہوں نے انتھک کوشش سے نہ صرف یہ کہ بنگلہ ناٹکوں کے سنہرے دورِ اول کو زندہ کیا۔ بلکہ ناٹک کی دنیا میں کئی نئے تجربے کئے، اور بنگلہ ناٹکوں کو ہر لحاظ سے نئی زندگی دی اور اسٹیج کو عوامی بیداری کے کاموں میں استعمال کیا۔ ربندر ناتھ نے چھوٹے بڑے، قسم قسم کے تقریباً چالیس ناٹک لکھے اور ان کو اسٹیج کیا۔ ان میں منظوم ڈرامے، گیت اور سُر سے پُر ڈرامے، رمزیہ ڈرامے اور سیاسی ڈرامے سب ہی کچھ شامل ہیں اس سلسلے میں ربندر ناتھ کا ایک اور اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے متوسط طبقہ کے گھروں سے قدامت پسندی کا جال توڑ کر لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری سے آزادی بخشی۔ انہوں نے لڑکیوں کو شانتی نکیتن کی کھلی فضا میں گانا، ناچنا اور کھل کر ڈراموں میں اداکاری کرنے کی تعلیم بھی دی۔ ان کی اس کوشش سے متوسط گھرانے کی لڑکیوں نے ثقافتی میدان میں قدم رکھا۔ یہ ان کا ایک نہایت جرأت مندانہ

قدم رہا ہے۔ انہوں نے جس رقص کی تعلیم دی بعد میں وہ طریقہ "رابندر ناچ" کہلایا۔ اس سلسلے میں
ٹھاکر نے کتھا کلی، بھارت ناٹیم، منی پوری اور جنّی کہ سنتھالی رقص کی ٹکنیک کا بھی غائر مطالعہ
کیا اور "رابندر ناچ" ایجاد کیا۔ اس طرح "رابندر سنگیت" کی طرح خاص کر ڈراموں کے لئے انہوں
نے "رابندر ناچ" کو ترقی دی اور اسٹیج پر "چترانگدا" اور "فالگونی" جیسے رقص ڈرامے پیش کئے۔
جو فنی طور پر اپنی مثال آپ ہیں اور آج بھی مقبول ہیں۔ انہوں نے ڈراموں سے سماجی کاموں میں مدد
لی۔ مثلاً ۱۹۱۶ء میں جب ضلع باٹکوڑا میں قحط پڑا تب رابندر ناتھ نے قحط کے ماروں کی امداد کے
لئے کلکتہ میں فالگونی کو اسٹیج کیا اور ٹکٹ کی فروخت سے جو روپیہ ملا اس سے قحط زدہ لوگوں
کی امداد کر کے یہ مثال قائم کی کہ فن کو پیش کر کے عوام کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ شانتی نکیتن اور
وشوا بھارتی کی مالی امداد کے لئے انہوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں میں بلکہ دیگر
ممالک میں بھی ڈرامے اسٹیج کئے اور لاکھوں روپیہ چندہ حاصل کیا۔ سودیشی تحریک کے
زمانے میں انہوں نے جو ڈرامے لکھے اس سے قومی شعور کو بلند کرنے میں کافی مدد ملی۔ "پراشچتہ"
(پراشچت) جس کی کہانی کو انہوں نے ناول "بوٹھاکرانی نیرہاٹ" سے قبول کیا۔ اس میں ہم پہلی
بار ایک "عوامی لیڈر" کو پاتے ہیں جو عوام کے دکھ درد کا ساتھی ہے۔ رابندر ناتھ کے ڈراموں میں
"چترانگدا"، ڈاک گھر، فالگونی، چرا کمار سبھا، راجا ورانی، راجا، بسرجن، مکت دھارا، کالیر جاترا،
اور "رکت کربی" چند ایسے ڈرامے ہیں جو ان کے دور میں بار بار اسٹیج پر کھیلے گئے ہیں اور نہایت مقبول
ہوئے اور آج بھی ان ڈراموں کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔

یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ رابندر ناتھ کے ہر ڈرامے کا ذکر کیا جائے۔ لیکن رابندر ناتھ کے وہ
تین ڈرامے، جن ڈراموں نے بنگلہ ڈراموں کا رخ موڑ دیا اور ڈرامے کو عوامی بیداری کے کام میں
پہلی بار لے آیا کا خاص کر مختصر ذکر ضروری ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ان میں سے دو ڈرامے انہوں نے
سفر روس سے بہت پہلے لکھے اور اسٹیج کئے تھے اور آخری ڈراما "کالیر جاترا" (رفتار زمانہ) کی
تخلیق انہوں نے ۱۹۳۲ء میں کی۔ چونکہ وہ ۱۹۳۰ء میں روس کا سفر کر چکے تھے۔ اس لئے کہا جاتا
ہے کہ سفر روس میں انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اب محنت کشوں کا زمانہ آ گیا ہے لہذا انہوں نے
"سماج کے رتھ" (گاڑی) کو آگے کھینچ لے جانے کی رسّی مزدوروں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔

مذہب بھی ٹھاکر کے کئی ناٹکوں کا موضوع ہے لیکن ٹھاکر کے ہاں مذہب قدامت پرستی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان ڈراموں میں ٹھاکر نے مذہب کے اس مضبوط قلعہ پر وار کیا، جس کے بند دروازے باہر سے کسی قسم کی نئی روشنی اور ہوا کے داخل ہونے کو روکے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس قلعہ کے تمام دروازوں کو توڑ دیا تاکہ مذہب نامی قدیم قلعہ کے اندر تازہ ہوا آئے، نئی روشنی کی کرنیں اس بوسیدہ قلعہ میں داخل ہوں۔ کارل مارکس جن کو مذہب کا دشمن قرار دیا جاتا ہے، نے بھی دراصل مذہب کے سلسلے میں ان ہی خیالات کو اُجاگر کیا ہے۔ مارکس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ انسانی سماج کی ترقی کے مختلف مرحلوں میں جو نئے نئے مذاہب آئے۔ مثلاً بدھ مت، عیسائی اور مذہب اسلام وغیرہ، یہ سب اپنے اپنے عہد میں، اس وقت کے لحاظ سے سماجی انقلاب تھے، چونکہ ہر نئے مذہب نے قدیم سماج کے کئی فرسودہ روایات، رسم و رواج اور خیالات کو توڑ دیا لیکن وہ نیا مذہب جو کبھی سماج کے لئے ایک ترقی یافتہ قدم تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ ایک ایسا جال بن گیا کہ اس جال میں لوگ بری طرح پھنس کر رہ گئے۔ اور آگے قدم بڑھا نہ سکے۔ یعنی صدیوں کی رفتار سے مذاہب ایسے تاریک قلعے بن گئے، جس میں پھر سے کوئی نئی روشنی داخل نہیں ہو سکی۔ لہذا مذاہب ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد سماج کی ترقی میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے۔ ٹھاکر نے اپنا ڈراما "اچلائتن" میں جو ۱۹۱۱ء کی تخلیق ہے یہی دکھایا ہے۔ "اچلائتن" کا گرو اس قدیم قلعہ کو ہتھیار سے توڑ کر چور چور کر دیتا ہے اور قلعہ کے باشندوں کو نئی روشنی اور باہر کی کھلی ہوا میں لے آتا ہے۔ "اچلائتن" کا سبق یہی ہے کہ اگر مذہب سماج کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن جائے اور انسانیت کی ترقی کے راستے میں پہاڑ بن جائے، تب یہ ضروری ہے کہ مذہب نامی قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔

"رکت کربی" ۱۹۲۴ء میں لکھی گئی جس پر بنگلہ ادب میں کافی بحث و مباحثہ ہوا ہے اس ڈرامے سے بنگلہ ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کا ہوا۔ اس ڈرامے کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں ایک سرمایہ دارانہ سماج پر تنقید اور دوسرا تنقید و تبصرہ کے بعد نتیجہ کا اعلان۔ ٹھاکر نے اس ڈرامے میں اعلان کر دیا کہ سرمایہ دارانہ سماج موت کے دروازے پر ہے اور یہی "رکت کربی" کا فیصلہ ہے اس کے بعد کا ڈراما "رتھیر رشی" یا "کالیر جاترا" ہے۔ یہاں "رتھ" پورے سماج کی گاڑی ہے۔ اور "رشی" یعنی "رسّی" یا ڈوری، وہ رسّی ہے جس کو کھینچنے پر سماج کی یہ گاڑی آگے چلتی ہے۔ اس ڈرامے

میں ربندر ناتھ نے دکھایا کہ اب سماج کے رتھ کی رسّی محنت کشوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے اور وہی رسّی کو کھینچ کر سماج کو آگے لے جائیں گے۔ ڈراما میں سرمایہ دار، سپاہی، پنڈت، ایک ایک کرکے، ایک کے بعد ایک سے ہوتے ہوئے جب رتھ کی رسّی مزدوروں کے ہاتھوں میں آگئی تو ڈرامے میں سپاہی نے شاعر سے سوال کیا۔

"سپاہی —— تم تو لمبی تقریر کرکے نصیحت دیتے جا رہے ہو اور دوسری طرف تو آگ لگ گئی ہے۔

شاعر —— ایک دور کے ختم ہونے پر تو آگ لگے گی ہی۔ جو جل کر راکھ ہونا ہے، وہ راکھ ہو جائے گا۔ اور جو کچھ باقی بچے گا، اسی سے نئے دور کی تعمیر شروع ہوگی۔

سپاہی —— تو، اب تم کیا کروگے، شاعر —— ؟

شاعر —— اب میں نئے سُر میں نئے سماج کے گیت گاؤں گا۔"

ٹیگور آرٹ

⑤ مصوّری

شری تارا پرشاد داس نے رابندر ناتھ کی مصوّری کو خصوصیات کے لحاظ سے تین دور میں تقسیم کرتے ہوئے لکھا[1]۔۔۔

"پہلے دور کی مصوری میں رنگین عکاسی بہت نمایاں ہے، کیونکہ اس دور میں انھوں نے اس دنیا کی مخلوقات کو، ہوا اور پانی کو اپنی مصوّری میں جگہ دی ۔۔۔ دوسرے دور میں خشکی کے مناظر کی بھی عکاسی کی ہے بچپن ہی میں ٹھاکر کو قدرتی مناظر سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور شلائی داہ اور شانتی نکیتن کے ماحول نے اس لگاؤ کو اور بھی مستحکم بنا دیا ۔۔۔ تیسرے دور کی مصوری میں انھوں نے انسانی چہروں کو، جن میں ان کا چہرہ بھی شامل ہے پیش کیا۔ اس دور کی تصویروں میں انسانی جذبات کا اظہار ہے۔ انھوں نے عورتوں کی تصویریں بنائیں جن کے چہرے کی بے رونقی اور زردی آج بھی سربستہ راز ہے۔ ان تصاویر کی خاموشی ایک خصوصی جذبہ کو اُجاگر کرتی ہے۔"

---

[1] پندرہ روزہ "مغربی بنگال" کلکتہ۔ شمارہ نمبر ۱۰۔ جلد نمبر ۳۳۔ مورخہ ۹ مئی سنہ ۱۹۸۶ء۔

ٹھاکر مصوّری کی طرف اپنی زندگی کے آخری دور میں آئے۔ ایک ایسے دور میں جب ایک عام آدمی محض یادِ ماضی کے سہاروں پر زندہ رہتا ہے اور زندگی کی تمام تر سرگرمیوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے ٹھاکر نے جب قلم کے علاوہ برش کو بھی ہاتھ میں لیا اور برش کو مختلف رنگوں میں ڈبو کر اس سے تصاویر بنانے کا کام لینے لگے تب ان کی عمر ساٹھ کا کوٹھا پار کر چکی تھی۔ اور اس آخری عمر میں انہوں نے جو تصاویر بنائیں ان کی تعداد کوئی تین ہزار کے قریب ہے مشہور مصور نندلال بوس نے ٹھاکر کی مصوّری کے سلسلے میں لکھا ہے۔[۱]

"ادبی میدان میں اس وقت ان کو عالمگیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ مذہب، سیاست، سماجیات کے سلسلے میں ان کو ایک بنیادی مفکر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ تعلیم کے میدان میں ان کے تجربے اور دلیرانہ اقدامات نے دنیا کی نگاہوں کو ان کی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اور سینکڑوں گیت گا کر وہ عوام کے دلوں کو جیت چکے تھے۔ ٹھیک ایسے وقت میں گرودیو (ٹھاکر) نے تصویریں اتارنا شروع کیں۔ جو لوگ ان کی مصوّری کی روح تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے ۔۔۔۔ گرودیو نے ابتدا سے جوانی میں ایک بار تصاویر بنانے کی کوشش کی تھی ۔۔۔۔ لیکن جم کر مصوّری میں ہاتھ انہوں نے اس وقت لگایا جب وہ تقریباً ستّر کے قریب تھے۔ سب یہی جانتے ہیں کہ وہ حسن کے دلدادہ تھے۔ لہذا ہر چیز میں صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اپنی تحریر کے کسی حصے میں کاٹ چھانٹ کرنے کے لئے وہ ان الفاظ پر سیاہی لیپ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے دیکھا کہ اس کاٹ چھانٹ میں ایک تصویر سی ابھر آئی ہے اور ان کو یہاں وہاں، ذرا بہت قلم کی نوک

---

[۱] رابندر سمرتی۔ مرتب وشوا ناتھ دے۔ بار اول ۱۹۶۱ء ص ۱۱۲

سے حرکت دی جائے تو وہ پھول، پرند یا کوئی اور جانور کی شکل میں
نمودار ہو سکتے ہیں۔ بس یہی وہ خیال تھا جس کے عمل نے رفتہ
رفتہ ان کو مصور بنا دیا ——————"

شریمتی رانی چندکو ربندر ناتھ سے قریب ایک طویل عرصہ تک شانتی نکیتن میں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ ربندر ناتھ کیوں کر تصاویر بناتے تھے کے سلسلے میں محترمہ کا بیان کافی ہمیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔[۱]

"کھڑی کھڑی ان کو تصویریں بناتے دیکھتی۔ مجھے نشہ سا ہو گیا
تھا۔ وہ رنگ پر رنگ چڑھاتے جاتے۔ بہت جلد جلد......
ہاتھ کے قریب جو شیشی پاتے اسی میں برش ڈبو دیتے۔ کئی
بار ایک کے بدلے ایک رنگ چڑھا دینے سے پوری تصویر ہی کو
بدل دینا پڑا۔ دیکھ دیکھ کر میں عادی ہو گئی تھی کہ وہ کس رنگ کے
بعد کس رنگ کا استعمال کرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ کس تصویر
میں کیا کیا رنگ چاہیئے۔ تصویر کی ابتدائی شکل دیکھ کر میں ضروری
رنگوں کی شیشیاں ان کے ہاتھ کے قریب رکھ کر باقی رنگوں کو
دور ہٹا دیتی...... چند دنوں میں ان کی عادت سی ہو گئی تھی
تصویر بناتے وقت وہ مجھے بلا بھیجتے۔ وقت پر رنگ ہٹا دینے
سے خوش ہوتے اور میں ان کی تصویر بنانا دیکھتے دیکھتے کھو
سی جاتی۔ کئی بار مجھے ماڈل بنا کر تصویر بناتے۔ حالانکہ مجھے تصویر
میں اور مجھے خود میں کوئی یکسانیت تلاش کے باوجود نہیں ملتی
تھی۔ پہلے پہل مجھے کچھ افسوس سا ہوتا لیکن بعد میں اس میں
بھی خوب لطف آنے لگا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں

---

[۱] ربندر سمرتی۔ مرتب، وشوا ناتھ دے۔ بار اول ۱۹۸۶ء ص ۵۱

کاغذ پنسل تھما کر، خود پوز بنا کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "مجھے اتاریئے۔"

وہ ہنس کر تصویر اتارنے لگے۔ ایک منٹ سے زیادہ خاموش

بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اسی دوران، پنسل سے لکیریں

اتار کر پھر اس پر ایک کے بعد ایک رنگ چڑھانے لگ جاتے۔ ہوتے ہوتے

وہ تصویر کچھ سے کچھ ہو جاتی اور ہم دونوں ہنس دیتے۔ وہ کہتے۔

"تجھے فخر ہونی چاہیئے، دیکھ تو، میں نے تجھے کتنے روپ میں دیکھا ہے۔"

قریب ہوں، چپ رہنے پر شاید مجھے بُرا لگے اس لئے تصویر بناتے

ہوئے باتیں کرتے جاتے۔ کہانی، قصے ------ اور پھر تصویروں سے

بھی باتیں کرتے ...... "کیوں جی، کیوں منہ بنائے ہوئے ہو،

تمہیں اور ذرا رنگ چاہیئے۔ ؟ یہ کالا رنگ تمہیں پسند نہیں آیا۔؟ اچھا،

یہ لو ---- دیکھو تو کس کس طرح تمہارا دل پانے کی کوشش

کر رہا ہوں، پھر بھی تمہاری آنکھیں کیوں تر ہیں؟ بھیگی بھیگی آنکھیں

...... میں، ہاں مجھے بھیگی بھیگی آنکھیں پسند ہیں ——"

مجھے خوب مزا آتا۔ چھوٹی بچی کی طرح قریب کھڑی رہ کر ان کی باتیں

سنا کرتی، —— پھر سوچتی کہ شاید اس طرح اپنی تخلیق سے

باتیں نہ کی جائیں تو تخلیق کرنے میں خوشی نہیں ہوتی —— !"

۱۹۳۰ء میں جب ٹھاکر کی مصوری کی نمائش شہر پیرس (Paris) میں ہوئی۔

اس وقت ہندستان میں بطور ایک مصور کے ان کے نام سے بیشتر لوگ آگاہ نہیں تھے۔ لہٰذا جب

یہ خبر اخبارات میں چھپی تو بہت سے لوگ دنگ رہ گئے۔ وہاں نمائش میں ۱۲۵ نمونے رکھے گئے تھے۔ ان

کی مصوری کی دوسری اور تیسری نمائش برمنگھم (Birmingham) اور پھر انڈیا ہاؤس

لندن میں ہوئی۔ اس کے بعد دورۂ جرمن کے دنوں برلن میں جہاں "ان کی پانچ تصویریں" برلن

نیشنل گیلری کے لیئے خریدی گئیں۔ جرمنی میں دوسری نمائش میونک (Munich) کے

گیاسری آرٹ گیلری Casperi Art Gallery میں ہوئی۔ اور پھر سفر روس.

ٹیگور آرٹ
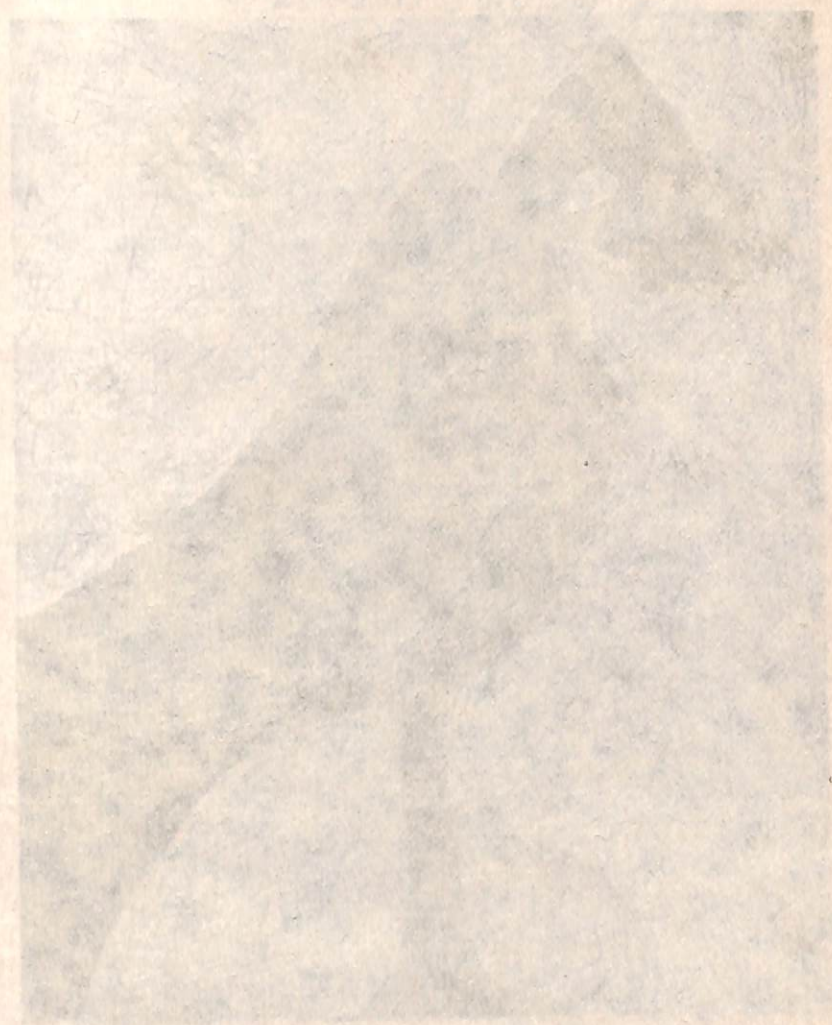
کے دنوں، ۷ستمبر ۱۹۳۰ء کو ماسکو شہر کے اسٹیٹ میوزیم میں ان کے تصاویر کی نمائش پٹرو ایلینگوف (Petrove Ellingove) اور پروفیسر کروستی (Prof. Kinstie) وغیرہ کی مدد سے ہوئی۔ اس کے بعد امریکا کے شہر بسٹن اور نیویارک میں نمائش کا اہتمام ہوا۔ اس طرح ٹھاکر کی مصوری کی نمائش دنیا کے کونے کونے میں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ شری سمرناتھ بھومک نے کہا ہے کہ ٹھاکر کو جدید ہندستان کا پہلا بین الاقوامی مصور ہونے کا شرف حاصل ہے[۱]

ربندرناتھ نے اپنی تصویروں کو کوئی نام نہیں دیا۔ وہ کہتے:

"تصویر کو کوئی نام دینا ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کوئی عنوان سوچ کر کوئی تصویر نہیں بنائی ہے...... لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ جو لوگ تصویر دیکھیں یا خریدیں وہی ان کو اپنی پسند کے مطابق نام دیں"

پارس کے نامور فنکار آریس۔ مل وارڈتے ٹھاکر کی تصویروں کی نمائش دیکھنے کے بعد لکھا[۲]

"میں کیسے بیان کروں کہ میں نے کیا دیکھا؟ کسی تصویر کا کوئی نام نہیں ہے۔ خواب کو کیا نام کے دائرے میں قید کیا جا سکتا ہے؟ دیکھیں گے، نام دے لیں گے۔ ظالم کالی کالی پرچھائیاں ہیں جو ڈراتی ہیں۔ کھلونے حسین نقشے ہیں۔ جن کی طرف دیکھئے پر وہ رقص کرتے ہیں۔ ...... طرح طرح کے چہرے یا صرف دو آنکھیں، جو تاریکی کو چیر کر میرا پیچھا کرتے ہیں.......... شاید ایک پوٹریٹ، ایک ادا، لب پر ہلکی لہر کی طرح گزر جانے والی ایک مسکراہٹ، ایک خواب۔؟ ہاں ایک خواب ہی ہے! نہایت فطری، حسین...... اس سے قبل

۱؎ انگریزی رسالہ "ویسٹ بنگال" ٹھاکر نمبر ۹ مئی ۱۹۸۶ء ص ۱۶۰

۲؎ وشوا ناتھ سبھائے ربندرناتھ۔ موئیتریا دیوی ص ۲۸۱

مصوّری کی کسی نمائش نے مجھے اس قدر متاثر نہیں کیا ——— "

میونک کے کیا سپری آرٹ گیلری میں نمائش چل رہی تھی۔ جب نمائش دیکھنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی مصوّری کے سلسلے میں کچھ کہیں تو انہوں نے مختصر سی تقریر میں اپنی شاعری اور مصوّری کے بھید بھاؤ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کبھی بھی شاعری کا درست طور پر دیگر کسی زبان سے ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ ترجمے میں شاعری کی کئی خصوصیات اور خوبیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ لیکن تصاویر ترجمہ کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ خود سب سے اپنی بات کہہ دیتی ہیں۔ اس لئے میری شاعری میرے وطن والوں کے لئے ہے۔ اور اپنی مصوری کو میں بطور تحفہ مغربی دنیا کے لئے پیش کرتا ہوں۔"

ماسکو میں ان کی تصویروں کو جس طرح روسی عوام نے قبول کیا اور جس طرح وہاں کے نامور مصوّروں نے ان کے فن کی تعریف کی اس سے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اسٹیٹ میوزیم کی تقریر میں کہا:۔

"آپ لوگوں کی تعریف سے میں بے حد خوش ہوا ہوں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس ملک کے ماہر مصوّروں نے ہی مجھے کامیاب قرار دیا ہے ...... میری یہ تعلیم نئی ہے اس لئے اس سلسلے میں ابھی اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتا ہوں۔ لہذا جب تصویروں کی تعریف سنتا ہوں تو سب سے زیادہ مسرّت ہوتی ہے۔ میرا دل ابھی اس منزل کو نہیں پا سکا ہے جس منزل پر پہونچ کر میں اپنی تنقید کر سکوں۔ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا فیصلہ کر سکوں۔ لہذا جن کے پاس وہ نظر ہے، جو فن کو پرکھ سکتے ہیں۔ ان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ لوگوں کی تعریف سے آج اتنی مسرت ہوئی ....
میں ان تصویروں کو اس لئے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کیوں کہ

ان کی وجہ سے مغربی ملکوں کے دلوں کو چھو سکا۔ الفاظ نے مجھے
ناکام کیا، باتیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ مجھے باتوں کے لئے مترجم کی
مدد لینی پڑی، اور دل کی کلی کھل نہیں سکی۔ امید کرتا ہوں میری
تصاویر آپ لوگوں میں اور مجھ میں خیال کے بندھن کو مضبوط
باندھے گی۔ بے زبانوں کو ایسی زبان دے گی کہ ایک دوسرے
سے قریب تر ہو جائیں گے۔"

ٹھاکر کی چند تصاویر ان کے سیاسی خیالات کو بھی اُجاگر کرتی ہیں۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم کے دنوں انہوں نے فاشسٹ مسولینی کی ایک بھیانک تصویر بنائی تھی گویا ایک راکشش ہے جو پوری انسانیت کو کھا جانے کے لئے تل گیا ہے۔

ٹیگور حیدرآباد میں —— مہاراجہ کشن پرشاد اور سر احمد حسین امینِ جنگ کے ہمراہ

اردو دانشوروں سے ٹھاکر کے تعلقات
اور
اردو ادب پر ٹھاکر کے اثرات

جب کہ رابندر ناتھ ٹھاکر کے تعلقات دنیا کے کونے کونے کے اہل علم و قلم سے رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خود ان کے وطن ہندستان کی ایک بلند علمی ادبی اور ثقافتی زبان کے لوگوں یعنی اردو کے دانشوروں اور صاحب قلم حضرات سے ان کے تعلقات نہ رہے ہوں؟ اور یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ اردو نے بنگال کے اس عظیم فنکار کا کوئی اثر قبول نہ کیا ہو؟ لیکن یہ مقام افسوس ہے کہ اس موضوع پر اب تک تحقیقی کام نہیں ہوا ہے جس کی وجہ سے ہم اردو کے دانشوروں سے ٹھاکر کے تعلقات اور اردو ادب پر ان کے اثرات سے بخوبی آگاہ نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس پہلو پر بھرپور تحقیق کی جائے اور ایک مفصل کتاب لکھی جائے تاکہ ہم پر یہ واضح ہو کہ اردو کے صاحب علم و قلم سے ٹھاکر کے کیسے کیسے تعلقات رہے ہیں۔ بہرحال اس وقت مجھے جو کچھ تھوڑا بہت علم ہے وہی عرض کرتا ہوں۔

کلکتہ کے تین اردو کے اہل قلم کے سلسلے میں مجھے علم ہے کہ انہوں نے ٹھاکر کو دیکھا تھا اور ملاقات بھی کی تھی۔ وہ ہیں بنگال کے نامور افسانہ نگار خاتون محترمہ راحت آرا بیگم، اور

پھر حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی (لطیف الدین احمد اکبر آبادی) اور پرویز شاہدی۔ حضرت ل احمد اکبر آبادی اور پرویز شاہدی، دونوں سے بارہا ملنے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ پرویز نے ٹھاکر پر جو نظم کہی اور جس طرح اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کی کوئی اور مثال اردو شاعری میں نہیں ہے صرف دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جبینِ ہند پر نمایاں جو عظمت کے ستارے ہیں
وہ انگارے ہیں گیتوں کے وہ شعروں کے شرارے ہیں
وہ نورانی کنائے ہیں، وہ روشن استعارے ہیں
ترے ہی دل کے ٹکڑے ہیں، ترے ہی فکر پارے ہیں

حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی غالباً دو چار بار ٹھاکر سے ملے تھے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اردو ادب میں رومانی تحریک جسے ادب لطیف بھی کہا گیا ہے کے نامور قلم کاروں میں سے ایک ل۔ احمد اکبر آبادی رہے ہیں اور اردو ادب میں رومانی تحریک پر رابندر ناتھ ٹھاکر کا گہرا اثر رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ اسٹیشن سے (غالباً ۱۹۷۰ء کے ابتدائی دنوں میں) ایک گفتگو "ٹیگور اور ادب لطیف" کے موضوع پر نشر ہوئی تھی جس میں حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی اور راقم الحروف نے حصہ لیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ل۔ احمد اکبر آبادی نے مجھے لکھا کہ میں دو چار دن ان کے ہاں (نمبر ۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ، پہلی منزل پر لطیف سنس اینڈ کمپنی) آؤں۔ تاکہ ہم دونوں مل بیٹھ کر یہ فیصلہ کریں کہ کون کیا رُخ اختیار کرے۔ اور گفتگو کیوں کر ہو۔ ان ہی دنوں ل۔ احمد صاحب نے ٹھاکر سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا تھا۔ افسوس کہ ان کی باتیں آج یاد نہیں ہیں لیکن آج بھی ل۔ احمد اکبر آبادی کا وہ پوسٹ کارڈ (مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء) میرے ہاں محفوظ ہے جس میں انہوں نے مذکورہ موضوع پر گفتگو کے لئے مجھے آنے کی دعوت دی تھی۔

محترمہ راحت آرا بیگم (ولادت ۱۹۱۰ء وفات ۱۹۴۹ء) جن کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں، شمس العلماء کمال الدین احمد کی دختر نیک اختر اور بنگال کے

نامور اردو شاعر عبدالغفور خاں نساخ کی نواسی تھیں۔ محترمہ کی مادری زبان بنگلہ تھی۔ اور انہوں نے رابندر ناتھ کے چند افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ڈرامہ "ڈاک گھر" کا اردو ترجمہ بھی راحت آرا بیگم نے کیا تھا۔ جس ترجمے کو بقول راحت آرا بیگم خود رابندر ناتھ نے سن کر پسند فرمایا تھا۔ ڈرامہ کے پیش لفظ میں محترمہ لکھتی ہیں :-

"۷ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو میں رابندر ناتھ ٹھاکر سے ملنے گئی۔ ان کے کلکتہ جوڑاسانکو مکان میں۔ ساتھ میرے میاں بھی گئے۔ بہت ہی خلوص سے آپ ہم سے ملے۔ دیر تک بات چیت کی میں نے "ڈاک گھر" اردو میں ترجمہ کیا۔ سن کر بہت خوش ہوئے اور ہم دونوں کو شانتی نکیتن جا کر چند روز رہنے کی دعوت دی۔"

رابندر ناتھ ایک اچھے مصور بھی تھے۔ اس سلسلے میں شیخ سمیع الزماں (ولادت ۱۸۸۶ء ضلع بارہ بنکی، وفات ۱۹۶۹ء) عرف میاں جان سے ان کے تعلقات تھے۔ شیخ سمیع الزماں کئی سال کلکتہ کے ٹھاکر گھرانہ یعنی جوڑاسانکو سے منسلک رہے۔ وہ مغل طرز مصوری کے ماہر فنکار تسلیم کئے گئے۔ انہوں نے مصوری کی تعلیم گورنمنٹ اسکول آف آرٹس، کلکتہ میں پائی جس کے اورینٹل آرٹس سکشن کے انچارج ان دنوں ابنندر ناتھ ٹھاکر (رابندر ناتھ کے چچیرے بھائی کے بیٹے جو رابندر ناتھ سے تقریباً دس سال چھوٹے تھے) تھے۔ لہذا ابنندر ناتھ کے ساتھ جوڑاسانکو کے ٹھاکر گھرانے میں میاں جان عرصہ تک آتے جاتے رہے اور مصوری کا کام کرتے رہے۔ یہیں رابندر ناتھ سے ان کے تعلقات قائم ہوئے۔ "حیات ٹھاکر" کے مصنف پربھات کمار مکھوپادھیائے نے جلد دوم میں سمیع الزماں کا نام ضرور لیا ہے لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی تفصیل پیش نہیں کی ہے۔ سمیع الزماں نے کلکتہ ہی میں ابنندر ناتھ کی نگرانی میں فنی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ لوٹ گئے۔ یعنی ان دنوں سمیع الزماں کی عمر تیس برس تھی اور رابندر ناتھ کی عمر پچپن برس کی۔ شیخ سمیع الزماں کی دختر نیک عبیدہ زماں نے اپنے والد کا

تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے[1]

"میاں جان بتاتے تھے کہ بعد میں ٹھاکر نے آرٹس کالج میں تعلیم دینے کے لئے ملازمت کی پیشکش کی تھی۔ میرے والد بڑی آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ کسی قسم کی پابندی برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی افتاد طبع سے ٹھاکر خوب واقف تھے۔ اس لئے شرائط کچھ اس قسم کی رکھی تھیں کہ ہفتہ میں صرف دو تین روز ہی تعلیم دیں۔ وقت کی پابندی بھی نہیں رکھی تھی۔ دن کو جس وقت جی چاہے طالب علموں کو طلب کر سکتے تھے۔ یہ سب آسانیاں اور استاد کے اصرار (یہاں استاد سے اشارہ ابنندر ناتھ ٹھاکر کی طرف ہے راقم الحروف) پر میاں نیم راضی ہو گئے تھے۔ مگر ان کے گھر والوں، خاص کر ان کے بھائی خلیق الزماں نے پھر کسی طرح ان کو کلکتہ جانے ہی نہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد غلام محمد صاحب نے حیدر آباد میں خاص طور پر ان کے لئے آرٹ کالج بنوایا اور ان کو پرنسپل بنانا چاہتے تھے مگر اس تجویز کا بھی وہی حشر ہوا۔ خلیق چچا نے ان کو اس بار بھی لکھنؤ نہ چھوڑنے دیا۔"

بہر حال ان چند جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ ٹھاکر گھرانے سے میاں جان کا گہرا تعلق تھا۔ اور یہ بھی کہ شانتی نکیتن کے لئے ہی میاں جان کو بلایا گیا تھا۔ جہاں طلبہ رہ کر تعلیم پاتے ہیں۔ لہذا جب چاہے طلبہ کو بلا لیا جا سکتا ہے۔ ان دنوں خود ابنندر ناتھ شانتی نکیتن میں تھے۔ ۱۹۲۶ء میں شاہ دکن نظام حیدر آباد نے ربندر ناتھ کو وشوا بھارتی کے لئے ایک

---

[1] قومی آواز (ضمیمہ) لکھنؤ۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۳ء

لاکھ روپیہ عطیہ دیا تھا اور جب ۱۹۳۳ء میں مہاراجہ کشن پرشاد، شاد نے نظام حیدر آباد کی طرف سے ٹھاکر کو سفر حیدر آباد کی دعوت دی تھی تو انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی۔ اور حیدر آباد گئے۔ اس سفر پر بھی حیدر آباد کے کئی ہندو مسلم رئیسوں نے وشوا بھارتی کے لئے ٹھاکر کو مالی امداد دی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد جو خود اردو اور فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر و ادیب گزرے ہیں، نے ٹھاکر کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے نظام سرکار سے وشوا بھارتی کو ماہانہ ایک ہزار روپیہ امداد دینے کی سفارش کی تھی۔[۱]

حیدر آباد ان دنوں اردو زبان و ادب کا گہوارہ تھا۔ سفر حیدر آباد کے دنوں مہاراجہ کشن پرشاد کے علاوہ ٹھاکر کی ملاقات ان کے دیرینہ دوست عباس علی خاں لمعہ حیدر آبادی سے ہوئی تھی جو فارسی، اردو اور انگریزی کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ لمعہ کی شاعری کے سلسلے میں ٹھاکر نے لکھا ہے:[۲]

The same sun is newly born in New Lands in a song of end Less dawns.

ڈاکٹر لمعہ، رابندر ناتھ سے متاثر تھے اور ان کے اردو نثر کے اسلوب پر بھی ٹھاکر کی چھاپ نمایاں ہے۔ ان کے مضامین نثر کا مجموعہ "پریم رس" پر رائے دیتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا:[۳]

"پریم رس، اُن کے چھوٹے بڑے تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ بعض مضامین عموماً ٹھاکر کے رنگ کے ہیں ۔۔۔۔۔ اگر لمعہ کی بعض عبارتوں کے نیچے سے ان کا نام نکال دیا جائے تو خود ٹھاکر کی تحریر کا شبہ ہونے لگے ۔۔۔۔"

---

[۱] مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات۔ مرتب، مہدی نواز جنگ، حیدر آباد ۱۹۵۰ء ص ۱۴۳

[۲] "ہما ڈائجسٹ" دہلی، اقبال صدی نمبر، اگست ۱۹۷۶ء

مولوی عبدالحق نے بھی لکھا ہے ——

"اس مجموعہ نثر میں ٹیگوریت کی طرف میلانِ غالب کا پتہ دیتا ہے"۔ —— انہیں لمعہ حیدرآبادی نے ہندستان کے دو بڑے شعرا رابندر ناتھ ٹھاکر اور علامہ اقبال کی ملاقات کرانے کی کوشش کی تھی چوں کہ ان دونوں شعرا سے لمعہ کے اچھے تعلقات تھے۔ اکبر رحمانی جلگانوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے[۱]:-

"جب ٹھاکر لاہور تشریف لے جارہے تھے ڈاکٹر لمعہ نے ٹھاکر کو ایک خط لکھا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ لاہور میں اقبال سے ضرور ملیں۔ ٹھاکر لاہور پہنچے، تو وہ اقبال کی مزاج پرسی کے لیے ان کے گھر گئے۔ اتفاق سے علامہ اقبال اس وقت لاہور میں موجود نہ تھے"۔

ٹھاکر کب لاہور گئے تھے اور کب تک وہاں رہے اس کا ذکر ہم پربھات کمار مکھوپادھیائے کی بنگلہ تصنیف "حیات ٹھاکر" میں پاتے ہیں جس کے مطابق رابندر ناتھ ۱۴ فروری ۱۹۳۴ء لاہور پہنچے تھے اور وہاں دھنی رام بھلّا کے مہمان رہے۔ اکبر رحمانی جلگانوی نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال ان دنوں لاہور میں نہیں تھے۔ —— بہرحال ٹھاکر دو ہفتہ لاہور میں رہے اور اس دوران اقبال سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ٹھاکر کے صرف دو بیانات (ایک ڈاکٹر لمعہ کے نام خط اور دوسرا اقبال کی موت پر خراج عقیدت) ہی اقبال کے سلسلے میں ملتے ہیں۔ ٹھاکر کے خط سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کی شہرت سے آگاہ تھے اور ایک ناموس ہستی ہونے کی وجہ سے ضروری احترام کرتے تھے لیکن ٹھاکر اس سلسلے میں صاف گو ہیں۔ لمعہ کے نام اپنے خط مورخہ ۷ فروری ۱۹۳۳ء میں انہوں نے لکھا۔

۱۔ "ہما ڈائجسٹ"، دہلی، اقبال صدی نمبر، اگست ۱۹۷۷ء

"ان زبانوں سے جن میں اقبال شعر کہتے ہیں ناواقفیت کی بنا پر
ان کی قوت تخلیق کی گہرائیوں تک نہ تو میری رسائی ممکن ہے اور نہ
ہی میں ان کے کلام سے متعلق کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کرسکتا
ہوں لیکن اقبال کی نظموں کو جو شہرت اور مقبولیت نصیب
ہوئی ہے اس کی بنا پر مجھے یقین واثق ہے کہ اقبال کے ان جواھر
پاروں میں ادب جاوداں کی عظمت و تابناکی موجود ہے۔"

ربندر ناتھ کے سفر حیدر آباد کے دوران اردو کے جن نامور شعرا اور دانشوروں سے ان کی ملاقاتیں ہوئی ہیں ان میں ایک اہم نام نواب سر امین جنگ بہادر (اصل نام احمد حسین) ہے۔ یہ وہی نواب سر امین جنگ بہادر ہیں جو شاہ نظام کے ہمراہ ۱۸۹۹ء میں کلکتہ آئے تھے اور جو لارڈ کرزن کے ۱۹۰۳ء والے دربار دہلی میں بھی شریک ہوئے تھے۔ جناب غلام پنجتن نے حیدر آباد میں نواب سر امین جنگ بہادر اور ٹھاکر کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"انہوں نے کرمن گھاٹ میں ایک باغ اور چھوٹا سا بنگلہ بنا لیا تھا
جس میں کبھی کبھی اپنے خاص احباب کو لے کر چلے جایا کرتے تھے
اور کچھ تفریح کر لیا کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ کسی
محفل میں یا اپنی خانگی ملاقاتوں میں ملکی معاملات پر کبھی گفتگو نہیں
کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے پاس وہی جاتے تھے جو ان
کی ادبی اور اخلاقی صحبتوں سے مستفید ہو سکے۔ جب ڈاکٹر ربندر ناتھ
ٹھاکر حیدر آباد آئے تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا۔ دونوں جب
بغل گیر ہوئے تو دونوں کی داڑھیاں مل گئیں۔ مہاراجہ بہادر نے
اس واقعہ کو ایک شعر میں موزوں کر دیا۔"

محفل میں آج جمع دو صاحبِ ریش
دونوں دلِ شاد اور دونوں دلریش

مولانا امجد علی نے اس پر مندرجہ ذیل دو مصرع لگا کر رباعی بنا دیا۔

ان دونوں کی مختصر تعریف یہ ہے
درویش پرست ایک، اک ہے درویش[1]

مولانا امجد علی حیدر آبادی جن کا نام ابھی ابھی اوپر لیا گیا ہے کا شمار نہ صرف اردو کے نامی گرامی شعراء میں ہوتا ہے بلکہ انہیں ایک استاد فن بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ رابندر ناتھ سے وہ متاثر تھے مخدوم محی الدین نے لکھا ہے[2]

"اگر ہم اردو میں ایسے شاعر کو ڈھونڈیں جس میں ٹھاکر کی سی روحانیت اور اس کا سا موہوم پن پایا جاتا ہو، تو ہمیں صرف ایک شاعر ملتا ہے اور وہ امجد حیدر آبادی ہے۔ امجد اور ٹھاکر کے کلام کو ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی روح دو مختلف زبانوں میں ہم سے کلام کر رہی ہے۔ امجد نے اور شعراء اردو کی طرح ٹھاکر سے متاثر ہو کر یہ رنگ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ خود ان کا اپنا رنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام

---

[1] صورت گران دکن۔ ناشر روزنامہ "سیاست" حیدر آباد۔ مئی ۱۹۷۹ء ص ۶۴

[2] ٹیگور اور ان کی شاعری۔ مخدوم محی الدین۔ پہلا ایڈیشن، ۱۹۳۵ء حیدر آباد ص ۱۰-۹

ہیں کیفیت اور اثر ہے۔ امجد اور اردو کے دوسرے شعراء میں جن پر
ٹھاکر کے اثر کا اطلاق ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے شعراء کا
فیض ٹھاکر کے اعلیٰ کلام کے انگریزی یا اردو ترجمے ہیں۔ برخلاف
اس کے امجد کا مصدر فیض وہی ہے جس سے خود ٹھاکر استفادہ
کرتے ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف اشارہ کافی ہے۔
البتہ دوسری کتاب "امجد اور ٹیگور" میں اس موضوع پر بحث کی
جائے گی۔"

میری نظر سے مخدوم کی تصنیف "ٹیگور اور ان کی شاعری" کا صرف پہلا ایڈیشن گزرا ہے۔ مرزا ظفر الحسن نے لکھا ہے کہ مخدوم کی اس تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں حیدر آباد سے طبع ہوا تھا "لیکن دونوں کے متن میں کوئی فرق نہیں ہے"[1]۔ اور انہوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ مخدوم نے امجد اور ٹھاکر کے موضوع پر پھر کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ بہر حال نواب سر امین جنگ بہادر کے بنگلے پر ٹھاکر کی امجد سے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے فوراً ایک شعر کہہ کر مہاراجہ بہادر (یعنی مہاراجہ کشن پرشاد) کے شعر کو وہیں رباعی بنا دیا تھا۔ اس سے ہمیں اتنا علم ضرور ہو جاتا ہے کہ امجد حیدر آبادی بھی ان شعراء و ادباء میں سے ایک ہیں جن سے رابندر ناتھ کی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک اور حیدر آبادی شاعر ایم۔ عبدالسلام ذکی ہیں جنہوں نے ٹھاکر کو حیدر آباد میں دیکھا اور ان سے ملاقات کی تھی۔ ٹھاکر سے اپنی ملاقات کے سلسلے میں ذکی صاحب نے لکھا ہے[2]۔

۱۹۳۳ء میں جب شاعر اعظم، نظام کالج میں مدعو کئے گئے تھے میں
نے اپنی لکھی ہوئی کچھ کتابیں پیش کی تھیں۔ اپنی آخری نظم سنانے

---

[1] عمر گزشتہ کی کتاب۔ مرزا ظفر الحسن۔ حسامی بک ڈپو، حیدر آباد ۱۹۷۸ء صہ ۱۶۳

[2] عالمی شاعر۔ از ایم عبدالسلام ذکی۔ حیدر آباد ۱۹۶۱ء صہ ۵

کی فرمائش پر ایک نظم ــــــ"

"داتا کرپا ہم پر کردے

علم و عمل سے جھولی بھر دے ــــــ"

سنائی تھی۔ سن کر خوش ہوئے اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

ان ہی دنوں مخدوم محی الدین بھی ربیندر ناتھ ٹھاکر سے ملے تھے لیکن وہ ان دنوں صرف ۲۳ تا ۲۵ برس کے نوجوان تھے اور جامعہ عثمانیہ کے طالب علم (غالباً ایم اے اردو) تھے۔ میں نے مخدوم کی عمر ۲۳ تا ۲۵ برس لکھی ہے۔ چوں کہ مخدوم کی سنہ ولادت کا آج تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ بعض نے ۱۹۰۶ء، بعض نے ۱۹۰۷ء اور بعض نے ۱۹۰۸ء کو سنہ ولادت قرار دیا ہے۔ مخدوم سے بارہا ملاقات کا شرف مجھے بھی حاصل ہے لیکن یہ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۴ء کا زمانہ رہا ہے جب میری عمر ۱۶ تا ۲۴ برس کی تھی۔ ان دنوں اتنا شعور کہاں تھا کہ کچھ لکھ کر بھی رکھتا کہ کس دن کہاں ملاقات ہوئی اور کیا باتیں ہوئی ہیں۔ ان دنوں ان ملاقاتوں کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لائق نہیں تھا۔ یوں تو شہر حیدر آباد کا بچہ بچہ مخدوم کا عاشق تھا لیکن آج جو مخدوم کے قریبی ساتھی کہے جا سکتے ہیں ان میں میرے خیال سے راج بہادر گوڑ، اختر حسن، حسینی شاہد، زینت ساجدہ عابد علی خاں اور سری نواس لاہوٹی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں جن کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم سے یہ لوگ قریب رہے ہیں اور ان میں بھی میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہی مخدوم کے سلسلے میں سب سے زیادہ اور درست علم رکھتے ہیں۔ چوں کہ میدان سیاست (کمیونسٹ پارٹی) میں بھی یہ دونوں ساتھی رہے۔

مخدوم کا ذکر کرتے ہوئے مرزا ظفر الحسن نے لکھا ہے کہ مخدوم[1] "کبھی کسی سے

---

[1] عمر گزشتہ کی کتاب۔ مرزا ظفر الحسن۔ حسامی بک ڈپو۔ حیدر آباد۔ ۱۹۷۸ء صہ ۴۸

مرعوب نہیں ہوا، نہ اقبال سے نہ ٹھاکر سے،، نہ نواب بھوپال سے اور نہ نظام دکن سے ؛، یہ درست ہے ۔ چوں کہ مخدوم کو اپنے آپ پر مکمل اعتماد تھا ۔ اور ان پر کوئی موڈ بہت دیر تک قائم نہیں رہتا تھا ۔ وہ ہنس مکھ تھے ، چنچل تھے ، شوخی ان کی طبیعت میں خوب تھی ۔ لیکن "مرعوب،، ہونا ایک الگ بات ہے اور "متاثر،، ہونا یا اثر قبول کرنا بالکل ہی اور چیز ہے اور یہ ضروری نہیں کہ آدمی براہ راست ہی "متاثر،، ہو جیسا کہ سید احتشام حسین نے "اردو ادب پر ٹیگور کا اثر" پر لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ـــ" اصل اثر ہمیشہ گہرا ہوتا ہے اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے ـــ،، اس طرح نوجوان فن کار مخدوم بھی ٹھاکر کا کلام پڑھتے اور ان کی دلکش شخصیت سے ملاقات کرنے کے بعد متاثر ضرور ہوئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حیات ٹھاکر پر اردو میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ۔ اور پہلے ایک مضمون "ٹیگور کی عالمگیر شہرت کا راز" (مجلہ عثمانیہ جلد ہشتم شمارہ ۱ اور ۲ ، ۱۹۳۵ء) کے عنوان سے لکھا اور پھر "ٹیگور اور ان کی شاعری" لکھی جو ۱۹۳۵ء میں کتابی شکل میں سامنے آئی اس کتاب کے دیباچے میں مخدوم نے لکھا ۔

" ٹھاکر کی عالمگیر اہمیت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ان سے جو تعلق اردو کو پیدا ہو گیا ہے اس کا اقتضا یہ تھا کہ اردو میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں شاعر کی زندگی اور اس کے کارناموں پر علمی بحث کی جاتی اور اس کے حقیقی پیام کو سمجھایا جاتا ۔ اب تک اردو میں ٹھاکر پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی حیثیت تعارفی مختصر مضامین سے زیادہ نہیں ۔ ان مضامین کا دائرہ بحث محدود تھا ۔ کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی جس کی وجہ سے شاعر کی ذات کے جملہ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ۔ اس کمی کے احساس نے مجھے اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا ۔،،

ربندرناتھ پر اردو میں کتاب لکھنے کی ضرورت کا ذکر جس انداز سے مخدوم نے کیا ہے اس سے ہی یہ صاف ہو جاتا ہے کہ کم از کم "غیر محسوس طور پر" وہ ٹھاکر سے متاثر ہو چکے

تھے۔ اس کتاب میں ٹھاکر کی ایک تصویر بھی ہے جس کے نیچے درج ہے کہ ٹھاکر نے اپنی یہ تازہ ترین تصویر بھیجی تھی۔ سید احتشام حسین نے مخدوم پر لکھتے ہوئے لکھا ہے[۵]:-

"ان کا (مخدوم کا) ذوق اور علمی سرمایہ، جوانی کا محدود مشاہدہ اور شوقِ اظہار اس شاعری کے لئے کافی تھا جس کے نمونے طور، ساگر کے کنارے، تلنگن، لمحۂ رخصت، جوانی، سجدہ، یاد ہے، وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ ایسی نظمیں تقریباً ہر نوجوان شاعر کہہ لیتا ہے کیوں کہ یہ تجربے عام ہیں۔ لیکن اس دور میں (جو غالباً ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء ہوگا) ان کی بعض نظمیں ایک ایسی گونج بھی پیدا کرتی ہیں جس میں تھوڑی بہت انفرادیت ہے جیسے "پچھلے پہر کا چاند سے، انتظار، برسات اور "میں"۔ اس زمانے میں مخدوم نے ٹھاکر اور ورڈسورتھ کو بھی پڑھا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے ذہن نے ان شعراء کے اثرات بھی قبول کئے ہوں ..... رومانیت کا فطری انداز، جوانی کے تقاضے، ٹھاکر اور ورڈسورتھ سے دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ حقیقتوں کو تخیل کی راہ سے پانے کا رجحان نمایاں ہوگیا۔"

کبھی کبھی بالکل ہی "غیر محسوس طور پر" کوئی بات دل میں گھر کر لیتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کہیں دیکھا تھا، سنا تھا یا پڑھا تھا۔ وہ خیال ذہن کے کسی کونے میں محفوظ رہتا ہے اور پھر یکایک ایک دن ابھر آتا ہے۔ مجھے اس کا تو علم نہیں ہے کہ رابندر ناتھ کی مختصر نظم "کرتبیا گرہن" (فرض قبول کرنا) حمایت علی شاعر کی نظر سے گزری تھی یا نہیں لیکن ان کی نظم "جواب" پڑھنے کے بعد یہ احساس جاگتا ہے کہ انہوں نے ٹھاکر کی مذکورہ نظم کا کوئی

۵۔ مضمون "ہم صفیر انقلاب۔ مخدوم" از سید احتشام حسین بہ ماہی "گفتگو" مدیر ,, ,, جعفری۔ جلد ۲ ۱۹۶۸ء صہ ۳۳۱۔

ترجمہ کہیں نہ کہیں پڑھا تھا یا کسی سے سنا تھا اور وہ بات ان کے ذہن کے کسی کونے میں محفوظ تھی جو ایک دن اچانک نظم "جواب" کے روپ میں ڈھل گئی۔ چوں کہ ان دونوں نظموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ "جواب" کو ربندر ناتھ کے نظم کا خوبصورت منظوم کا ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا دونوں نظموں کو پیش کرتا ہوں۔ ربندر ناتھ کی نظم "کرتبیا گرہن" کا آزاد ترجمہ یوں ہو سکتا ہے :۔

"ڈوبتے ہوئے سورج نے سوال کیا
"میرا کام کون سنبھالے گا ــــــ" ؟
سوال سن کر
پوری دنیا خاموش رہی
اور ایک مٹی کا دِیا، مسکرا کر کہہ کر اٹھا
"سوامی ــــــ،
مجھ سے جتنا ہو سکے گا
میں کروں گا ــــــ"

اس خیال کو نظم "جواب" میں حمایت علی شاعر یوں پیش کرتے ہیں :۔

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر

لہ مجموعۂ کلام [illegible] ۱۹۸۰ء

میں تھا تو اپنی راہ پہ کھی کا مزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمت میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات
سورج یہ کہہ کے چاہی رہا تھا کہ اک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا۔

اب اگر ہم حمایت علی شاعر کی اس نظم کو ٹھاکر کا "غیر محسوس اثر" کہیں تو کیا انکار ممکن ہے۔ کسی ایک زبان کے فنکار کا اثر دوسری زبان پر ترجموں کے ذریعہ ہوتا ہے اس لئے اردو ادب پر ربندر ناتھ ٹھاکر کے اثرات کو جاننے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ ٹھاکر کی تخلیقات کا ترجمہ اردو میں کتنا اور کیسا ہوا ہے اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ٹھاکر کی زندگی اور فن کے سلسلے میں اردو کے ادیبوں نے کیا لکھا اور کس قدر ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا تاکہ اردو کے ادباء و شعراء ربندر ناتھ سے اثر قبول کریں۔ جب ہم ٹھاکر کی تخلیقات کے اردو ترجموں پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ۱۹۱۳ء سے پہلے شاید ہی ان کی کسی تخلیق کا ترجمہ ہوا ہو۔ لیکن ۱۹۱۴ء یعنی نوبل انعام ملنے کے بعد سے ترجمہ کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ یہ ترجمے براہ راست بنگلہ زبان سے کم اور عموماً انگریزی یا ہندی وغیرہ سے ہوتے رہے ہیں۔

ٹھاکر کو نوبل انعام ملنے کے بعد دنیا بھر کی زبانوں میں انگریزی "گیتا نجلی" کے ترجمے ہونے لگے۔ اردو میں یہ کام سب سے پہلے نیاز فتح پوری نے انجام دیا۔ وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں ؎[۲]

"جس وقت اوّل اوّل مجھے اس حقیقت شناس کا حال معلوم

---

[۱] ٹھاکر کی اس نظم کا ترجمہ سالک لکھنوی نے بھی کیا جو ماہنامہ آہنگ (گیا) ماہ جنوری ۱۹۴۳ء میں چھپ چکا ہے [۲] عرض نغمہ (گیتا نجلی) نیاز فتح پوری ۱۹۱۴ء۔

ہوا تو میں متحیر رہ گیا کہ خدایا ٹھاکر نے کس مشین کی زبان میں شاعری
کی ہے جو یورپ یوں بے اختیار ہو گیا اور مجھے جستجو ہوئی کہ کوئی نظم
ملے تو دیکھوں لیکن افسوس ہے کہ میں ایک عرصہ تک اس آرزو میں
تڑپتا رہا۔ اور آخر کار جب اس کا مجموعہ نظم "گیتا نجلی" کا انگریزی
ایڈیشن شائع ہو کر مجھ تک پہنچا اور میں نے اپنے بیتاب ہاتھوں سے
کھول کر...... مطالعہ کیا تو...... مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے
فوراً اس کا ترجمہ "عرض نغمہ" کے نام سے شائع کر دیا۔"

نیاز فتحپوری کے علاوہ دیگر کئی شعراء و ادباء نے ٹھاکر کی تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے نیاز کے زمانے میں ہی مولانا ارشد تھانوی اور جوش ملیح آبادی نے "گیتا نجلی" کی بعض نظموں کا ترجمہ کیا تھا۔ منور لکھنوی نے بھی چند نظموں کا انگریزی سے منظوم ترجمہ کر کے شائع کیا تھا جو بعد میں (۱۹۲۹ء) ان کا مجموعہ کلام "کائنات دل" میں شامل کیا گیا ہے۔ اگست ۱۹۴۳ء میں گیتا نجلی" کا ایک ترجمہ کتابی طور پر سامنے آیا جس کے مترجم نرمل چندر ہیں۔ حال ہی میں گیتا نجلی کا ایک اور ترجمہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اور یہ ہے سید ظہیر عباس کا منظوم ترجمہ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اب تک ٹھاکر کی کتنی تخلیقات کا اردو ترجمہ ہوا ہے۔ ٹھاکر کے صد سالہ جشن کے دنوں ایک بار پھر ٹھاکر پر لکھنے کا زمانہ آیا۔ اور کئی اردو رسائل نے ٹھاکر پر مضامین نظم و نثر شائع کئے۔ اور چند رسائل نے خاص شمارے بھی نکالے۔ ان ہی دنوں ساہتیہ اکاڈمی نے ٹھاکر کی تصانیف کا دیگر ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کرنے اور کتابی طور پر شائع کرنے کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور فراق گورکھپوری نے ٹھاکر کی ایک سو ایک نظموں کا ساہتیہ اکاڈمی کے لئے ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور سجاد ظہیر نے بھی ان دنوں ٹھاکر پر قلم اٹھایا۔ سجاد ظہیر نے ہفتہ وار "عوامی دور" کا ایک خصوصی شمارہ (۷ مئی ۱۹۶۱ء) ٹھاکر نمبر کے طور پر پیش کیا۔ رسالہ "آجکل" دہلی نے ۱۹۶۱ء میں ایک خاص شمارہ ٹھاکر نمبر کے طور پر شائع کیا۔ بہر حال اب تک ٹھاکر پر مضامین نظم و نثر اردو والوں نے کافی لکھے ہیں اور ایسے مضامین لکھنے والوں اور مترجمین کی ایک طویل فہرست

آج مرتب کی جائے تو اس میں ستر اسی نام لینا ہوں گے۔ اب جس فنکار کی اتنی بہت سی تخلیقات کا ترجمہ ہوا ہو، اور جس پر خود اردو کے لئے بہت سے نامور صاحب قلم حضرات نے قلم اٹھایا ہو، تو ظاہر ہے اس کا اثر اردو ادب پر یقیناً ہوا ہے اس سلسلے میں سید احتشام حسین نے بجا طور پر لکھا ہے[۱] :-

"اردو ادب پر ٹھاکر کے اثرات کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا کہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اصل اثر ہمیشہ گہرا ہوتا ہے اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے۔ اور ان لوگوں کے شعور کا جز بن جاتا ہے جن کے ذریعہ وہ پھیلتا اور ظاہر ہوتا ہے۔"

اور پھر آگے چل کر اردو ادب میں ادب لطیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اردو میں رومانی میلانات بیسویں صدی کے دوسرے دہائی میں شروع ہوا۔ اور چوں کہ اس دور میں ٹھاکر کے ترجمے بہت ہو رہے تھے اس لئے اس اسلوب جس کو ادب لطیف کہا گیا پر ٹھاکر کا اثر نمایاں ہے اس اثر کے تحت لکھنے والوں میں خلیقی دہلوی، میاں بشیر احمد، جوش ملیح آبادی، سجاد انصاری، ساغر نظامی ... ان ادیبوں نے بہت واضح طور پر ٹھاکر کے اثر کا اعتراف تو نہیں کیا ہے ...... (لیکن) جوش، ورگا سہائے 'سرور'، افسر میرٹھی، اختر حیدر آبادی کے انداز بیان پر ٹھاکر کا اثر نمایاں ہے۔"

نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر بجنوری کا ذکر کرتے ہوئے سید احتشام حسین نے لکھا[۲] :-

"یہ دونوں انگریزی گیتا نجلی کی رنگینی، رعنائی، فصاحت اور اثر انگیزی سے مسحور ہو گئے ...... نیاز، ٹھاکر کی ماورائی عظمت اور

---

[۱] مضمون "اردو ادب پر ٹیگور کا اثر"۔ سید احتشام حسین۔ ماہنامہ "کتاب نما" دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء۔
[۲] رسالہ "نگار پاکستان" نیاز نمبر حصہ اول ۱۹۶۳ء

ادبی سحر کاری سے، اور ڈاکٹر بجنوری ان کی فلسفیانہ معنویت
اور اظہار کی بلندی سے متاثر ہوئے۔"

اردو ادب میں جمالیاتی دور کا ذکر کرتے ہوئے مجنوں نے نیاز کے سلسلے میں لکھا[۱]:۔

"نیاز فتح پوری نہ صرف اس نئے دور کے رہنما ہیں بلکہ ایک خاص ادبی دبستان کے بانی ہیں جس کو جمالیاتی دبستان کہنا چاہیئے۔...... نیاز کے نثری کارناموں کا آغاز...... شعر منثور سے ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں ان کے یہ ٹکڑے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور ہر نیا لکھنے والا ان کی تقلید کرتا نظر آتا۔ یہ شعر منثور زیادہ تر آسکر وائلڈ Oscar Wilde اور ٹھاکر سے ماخوذ تھے۔"

نیاز کا اردو ادب پر اثر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالودود خاں نے لکھا[۲]:۔

"گیتانجلی"، کے ترجمے سے نیاز کو ہی شہرت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ٹھاکر کے اسلوب کی تقلید اردو ادیبوں نے شروع کردی۔ یہ تقلید ادب لطیف کو فروغ دینے میں معاون ہوئی...... اس کے ان اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس نے ادب لطیف کی مروجہ روایات میں جدید اضافہ کیا۔ ٹھاکر کی اس تخلیق میں تصوریت، ماورائیت، تشبیہات واستعارات اور تراکیب کی جو جدت ہے نیاز نے اس کی تقلید کی۔ جو خوبیاں "عرض نغمہ"، میں ہیں وہی

۱۔ رسالہ "نگار پاکستان"، نیاز نمبر حصہ اول ۱۹۶۳ء۔

۲۔ اردو نثر میں ادب لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۰ء ص ۱۹۰۔

خوبیاں نیاز کے افسانوں اور انشائیوں میں ہیں۔ نیاز کا ترجمہ
نثر میں ہے لیکن اس میں تمام شاعرانہ خصوصیات موجود ہیں گیتانجلی
کا ترجمہ "نثر میں شاعری" کا مکمل نمونہ ہے شعر منثور اور ادب
لطیف کے نمونے اس سے پہلے بھی نظر آتے ہیں ..... لیکن گیتانجلی
کے اس ترجمہ نے اسے اور زیادہ فروغ دیا۔"

خود نیاز فتحپوری نے اپنے سلسلہ میں لکھا ہے "ٹھاکر کے طرز تحریر تو نہیں اس کی معنویت سے ضرور میں نے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا۔"[1]

ربندر ناتھ اور ان کی ادبی خدمات پر اردو میں پہلا مضمون غالباً ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا ہے جس میں انہوں نے اس بات پر افسوس کیا کہ خود ٹھاکر کے وطن میں ان دنوں تک ٹھاکر کو مقام حاصل نہیں ہوا تھا۔ اور وطن والے یہ سمجھتے تھے کہ ان کو نوبل انعام دینا بھی ایک سیاسی چال ہے۔ وہ لکھتے ہیں[2]:۔

"جب میں ہندستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا
میں بھی یہی حالت ہوئی ہوگی اور ٹھاکر کے اعجاز قلم نے سب کو حیرت
میں ڈال دیا ہوگا۔ لیکن یہاں عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت ٹھاکر
کے نام تک سے ناآشنا اور خواص کو اس کی خوبیوں سے منکر پایا
..... ہندستان کی منطق یہ ہے کہ ٹھاکر اور اقبال ہمارے ملک
کے لحاظ سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ان کا یورپ کے شعراء سے
مقابلہ کرنا اور ان کو مغنیان فرنگ کا ہم پایہ خیال کرنا یا استغفراللہ
——— ان سے ارفع اور اعلیٰ قرار دینا نہ صرف سوئے ادب
بلکہ گناہ ہے ..... مگر یورپ خود ٹھاکر کی تعریف میں رطب اللسان

---

[1] "نگار پاکستان" "نیاز نمبر" حصہ اول، کراچی ۱۹۶۳ء
[2] رسالہ سہ ماہی "اردو"۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن۔ اپریل ۱۹۲۵ء۔

ہے تو یہ کسرِ نفسی بھی کوئی مغربی ادا ہے اور اس میں بھی کوئی راز ہے۔
ورنہ ہند کی خاک سے کوئی فرزند کب اٹھ سکتا ہے"۔

عبدالرحمن بجنوری نے نیاز فتحپوری کے نثری ترجمہ کے بعد "گیتانجلی" کا نظم معریٰ میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور چند نظموں کے ترجمے نمونے کے طور پر ادبی رسائل میں شائع کروائے تھے۔ لیکن آپ نے اس کام کو پورا نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ یوں بیان کی ہے۔

"چوں کہ ٹھاکر کے کلام کو ترجمہ میں ادا کرنے کی عظمت کے لحاظ
سے ایسی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہو سکا۔
اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہوا"

مخدوم محی الدین نے مذکورہ اقتباس پیش کرتے ہوئے چند اشعار نمونہ کے طور پر درج کئے ہیں۔ ذیل میں صرف دو شعر درج کرتا ہوں۔

عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بہر کرم فرمائیے

جب تو دیتا حکم ہے مجھ کو کہ ہوں نغمہ سرا
فخر سے دل میرا سینہ میں سما سکتا نہیں

جوش ملیح آبادی کے سلسلے میں مخدوم اور سید احتشام حسین نے لکھا کہ ان پر ٹیگوریت کا اثر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں نے "اردو نثر میں ادب لطیف" میں جوش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جوش ملیح آبادی بھی ٹھاکر کی تقلید سے محروم نہ رہ سکے"۔ ص ۳۱۹۔

"روح ادب"، "مقالات زریں"، "اوراق سحر" اور "اشارات" جوش کی وہ تصانیف

ہیں جن پر ٹھاکر کا اثر صاف ہے۔ خود حضرت جوشؔ اپنے سلسلے میں لکھتے ہیں:[1]

"ابتدا میں شررؔ اور سرشارؔ کی نثر اور داغؔ اور انیسؔ کی شاعری سے متاثر ہوا۔ آگے بڑھا تو مومنؔ، میرؔ، غالبؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی نے متاثر کیا۔ پھر ٹیگوریت نے دل میں گھر کیا۔"

جوشؔ ملیح آبادی کی ایک نظم "شاعر ہندستان" ہے جو انہوں نے ۱۹۳۴ء میں دہلی میونسپلٹی کی طرف سے ٹھاکر کو ایڈریس دینے سے انکار کر دینے پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے فوری طور پر کہی تھی۔ ذیل میں نظم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوشؔ کے دل میں رابندر ناتھ ٹھاکر کو کتنا بلند مقام حاصل تھا۔

وہ جماعت شرم سے نام اپنا لے سکتی نہیں
ایڈریس سی چیز جو شاعر کو دے سکتی نہیں
آہ اے ٹیگور تو کیوں ہند میں پیدا ہوا
سچ بتا تو کس ادا سے ملک پر شیدا ہوا
اس جگہ تو کانپتی ہیں قہر کی پرچھائیاں
زندگی غائب ہے، مردے سانس لیتے ہیں یہاں
جہل کا دریا ہے اور ناقدریوں کی لہر ہے
شاعر ہندوستاں ہونا، خدا کا قہر ہے

حامد اللہ افسرؔ میرٹھی اردو کے ان چند نامور شعراء میں سے ایک ہیں جن پر ٹھاکر کا اثر بالکل نمایاں ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں افسرؔ نے ٹھاکر کی

---

[1] رسالہ "نیا دور"، کراچی، شمارہ نمبر ۴۳-۴۴

نظم ونثر کے بہت ترجمے کیے جو مشہور ادبی رسائل مثلاً اودھ پنچ لکھنؤ، نقیب بدایوں، شباب اردو لاہور، وغیرہ میں شائع ہوئے! انہوں نے "ماہ نو" کے نام سے ٹھاکر کی تصنیف "ششو" کا ترجمہ کیا۔ جو ۱۹۲۳ء میں میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ناول "نوکا ڈوبی" کا ترجمہ "طوفان" کے عنوان سے کیا۔ اور ٹھاکر کی ۱۲ کہانیوں کا ترجمہ "فسانہائے ٹیگور" کے نام سے کیا۔ یہ تصانیف انڈین بک ڈپو، میرٹھ سے شائع ہوئیں۔ مخدوم محی الدین نے افسر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا[۱]۔

"افسر تو خاص طور پر ٹھاکر سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

چنانچہ ان کا شعر ہے:۔

ایک ہو دیوانِ حافظ دوسرا گیتانجلی

ہوں یہ دو چیزیں تو پھر انسان دولت مند ہے

افسر کے مجموعہ کلام میں بعض نظمیں تو بالکل ٹھاکر کی نظموں کا ترجمہ ہیں۔ افسر نے صرف ٹھاکر کے خیالات سے استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ اردو نظموں کے لیے بعض وقت بحریں بھی بنگالی منتخب کی ہیں جس کے لیے "مالن" بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے۔"

منشی دیا نرائن نگم مدیر مشہور ادبی رسالہ "زمانہ" نے اپنے رسالے میں رابندر ناتھ ٹھاکر کی کئی تخلیقات کا ترجمہ شائع کیا۔ اس سلسلے میں دیا نرائن نگم کی خط وکتابت ٹھاکر سے رہی ہے۔ لیکن ایسے خطوط اب تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ چوں کہ ٹھاکر کی کئی تخلیقات کے ترجمے "زمانہ" میں شائع ہوتے رہے اس لئے ٹھاکر رسالہ "زمانہ" اور اس کے مدیر نگم سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب منشی دیا نرائن نگم نے "زمانہ" کا جوبلی نمبر (۱۹۲۸ء) نکالا تو ملک کے کئی ممتاز اہل قلم نے اپنی تخلیقات سے "زمانہ" کو زینت بخشی تھی۔ جن حضرات نے رسالہ کے لئے پیغامات بھیجے تھے ان میں رابندر ناتھ ٹھاکر بھی شامل ہیں[۲]۔

۱۔ ٹیگور اور ان کی شاعری، مخدوم محی الدین ص۔ ۱۰-۱۱

۲۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ۔ منشی دیا نرائن نگم نمبر ۱۹۸۲ء ص ۱۸

منشی پریم چند نے اپنے کئی خطوط میں اس حقیقت کا کھل کر اظہار کیا ہے کہ وہ ٹھاکر سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً ستمبر ۱۹۰۰ء میں وہ دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔
—— "میں نے اپنے خیال میں ربندر ناتھ کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے —— " ۱۴ر جولائی ۱۹۱۹ء کو امتیاز علی تاج کے نام لکھتے ہیں:۔
—— "اب کی زمانہ میں ربندر ناتھ پر ایک دلچسپ مضمون نکل رہا ہے ——" ۳ر جون ۱۹۳۰ء کو بنارسی داس چترویدی لکھتے ہیں —— "میرے اوپر... کچھ کچھ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹھاکر کا اثر پڑا ہے ——" ۲۳ر مارچ ۱۹۳۲ء کے خط میں اوپندر ناتھ اشک کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ رابندر ناتھ کا خاص مطالعہ کریں۔ چونکہ رابندر ناتھ کی تخلیقات "اعلیٰ درجے کی ہیں"—— ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو اندر ناتھ مدان کو صاف لکھتے ہیں۔ مختصر افسانوں میں شروع میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹھاکر سے روشنی حاصل کی ہے اس کے بعد میں نے اپنا اسٹائل بنا لیا ہے[۱]

یہ سب خطوط صاف کہتے ہیں کہ رابندر ناتھ کا کتنا گہرا اثر اردو اور ہندی کے نامور افسانہ اور ناول نگار پریم چند پر رہا ہے۔ ٹھاگر سے پریم چند کی مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے سید احتشام حسین نے بھی لکھا[۲]——

> "پریم چند کے دیہات، ان دیہاتوں کے سیدھے سادے باسی ان کے مزاجوں کی انوکھی خصوصیت اور افسانے کے مختصر ڈھانچے میں وحدت تاثر پیدا کرنے کا فن، سب ٹھاگر سے مماثلت رکھتے ہیں"——

اور ڈاکٹر عبدالودود خاں نے پریم چند کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[۳]:۔

---

[۱] ان سب خطوط کے لئے دیکھئے —— "پریم چند کے خطوط" مرتب مدن گوپال

[۲] "اردو ادب پر ٹیگور کا اثر" سید احتشام حسین۔ ماہنامہ "کتاب نما"، دہلی نومبر ۱۹۶۲ء

[۳] "اردو نثر میں ادب لطیف"۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں ص ۱۱۳

"پریم چند کو ٹھاکر کے فلسفے نے، ان کی انسان دوستی اور امن
پسندی و اتحاد کے جذبے نے متاثر کیا۔ دوسرے ٹھاکر کے طرز سے
متاثر تھے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ادب لطیف پر ٹھاکر کے اثرات ہیں اور
ٹھاکر کا اسلوب اپنانے کی کامیاب کوشش بھی کی گئی ہے۔"

آصف علی کی مشہور تصنیف "پرچھائیاں اور اس کا دوسرا رخ" انجمن ترقی
اردو نے ۱۹۵۰ء میں شائع کی جب کہ اس تصنیف کو ۱۹۵۳ء میں مصنف نے ان
دنوں مکمل کیا تھا جب وہ قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے۔ اس تصنیف کے سلسلے میں ڈاکٹر
عبدالودود خاں نے لکھا ہے[1]

"اس تصنیف کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اردو نثر میں کوئی
ایسی تصنیف اس کے علاوہ نظر نہیں آتی جس میں شروع
سے آخر تک ٹھاکر کا رنگ اختیار کیا گیا ہو۔"

اردو نثر میں ایک دور تھا (بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی)
جب چھوٹے چھوٹے جملے یا صرف ایک دو لفظ لکھنے کے بعد ہی کوئی لکیر (——) یا پھر
چند نقطے (.......) کھینچ دیئے جاتے۔ اردو میں اس کا رواج اختر شیرانی کے افسانوں
کا مجموعہ "دھڑکتے دل" کے شائع ہونے کے بعد فروغ پایا۔ اور اس طرز تحریر کو بھی ٹھاکر
اسٹائل (اسلوب) قرار دیا گیا۔ مثال کے طور پر اختر شیرانی کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ "آرزو"
کے چند جملے دیکھیے:۔

"........ ان پانچ ہفتوں میں ضرور کچھ نہ کچھ بات ہوئی ہے
...... مگر کیا؟ ...... کیسی .... اس نے پوچھنا چاہا
...... مگر .... ہمت نہ ہوئی .... چھوٹی بہن ایک
اداس اور دکھ بھری ہنسی ہنس کر بولی ..... آپا میرے سپید بالوں

---

[1] اردو نثر میں ادب لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں ص ۲۰۱

کو دیکھ رہی تھیں تم ـــــ ؟"

ہاں شیریں ـــــ تمہیں کچھ نہ کچھ ہوا ہے ـــــ پیش آیا ہے

ـــــ کوئی حادثہ ـــــ کوئی سانحہ ـــــ مجھے سچ سچ

بتاؤ ـــــ یاد رکھو جھوٹ بولوگی تو میں ـــــ سمجھ جاؤں گی"

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اردو کے کئی دانشوروں سے ربندرناتھ ٹھاکر کے اچھے تعلقات تھے اور اردو کے بے شمار اہل علم و قلم ان سے متاثر ہوئے ہیں۔ کم از کم اردو کے ادبا و شعرا میں نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، پریم چند، سدرشن، منشی دیانرائن نگم، ل۔ احمد اکبرآبادی، میاں بشیر احمد، سجاد انصاری، آصف علی ساغر نظامی، ارشد تھانوی، جوش ملیح آبادی، منوّر لکھنوی، افسر میرٹھی، اختر حیدرآبادی مخدوم محی الدین، عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی، امجد حیدرآبادی، درگا سہائے سرور فراق گورکھپوری، عبدالسلام ذکی اور محترمہ راحت آرا بیگم وغیرہ چند ایسے نام ہیں جو اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں۔

ٹیگور کا سفرِ آخرت
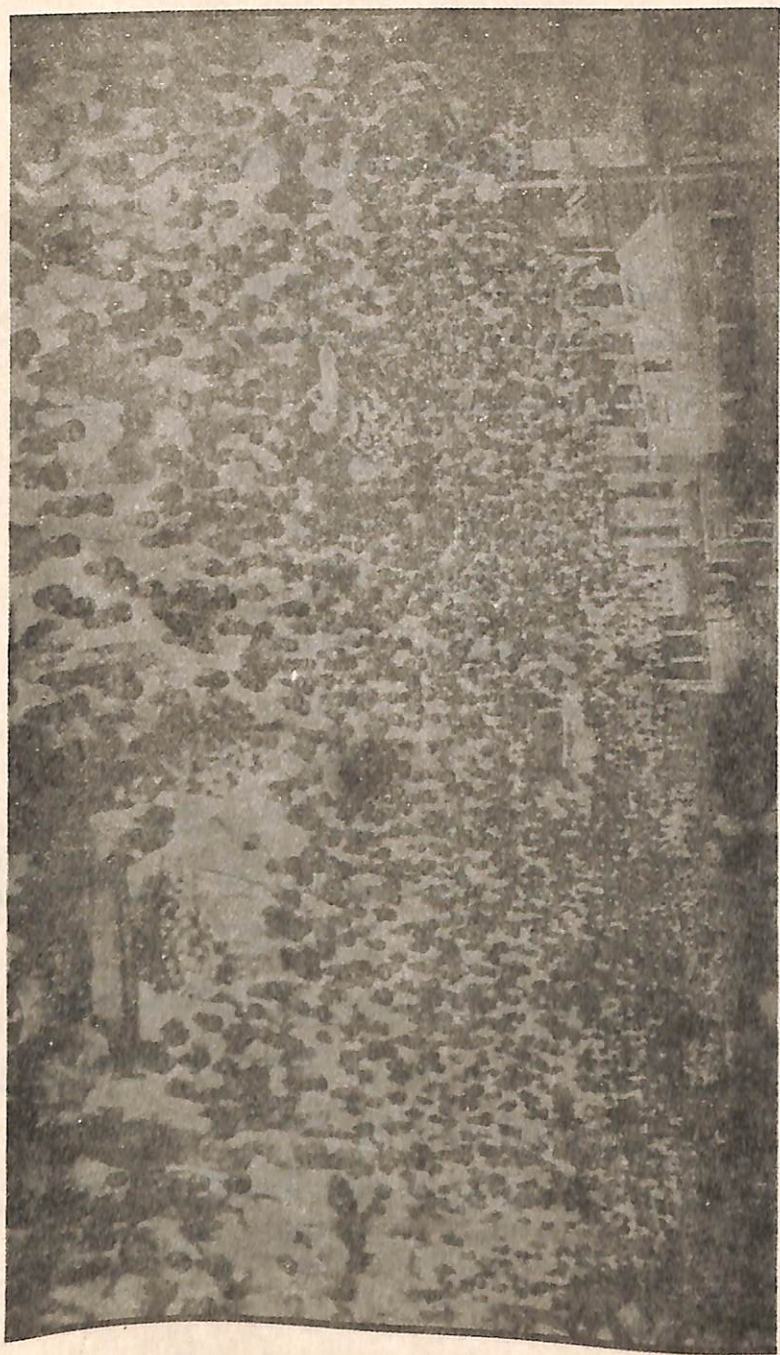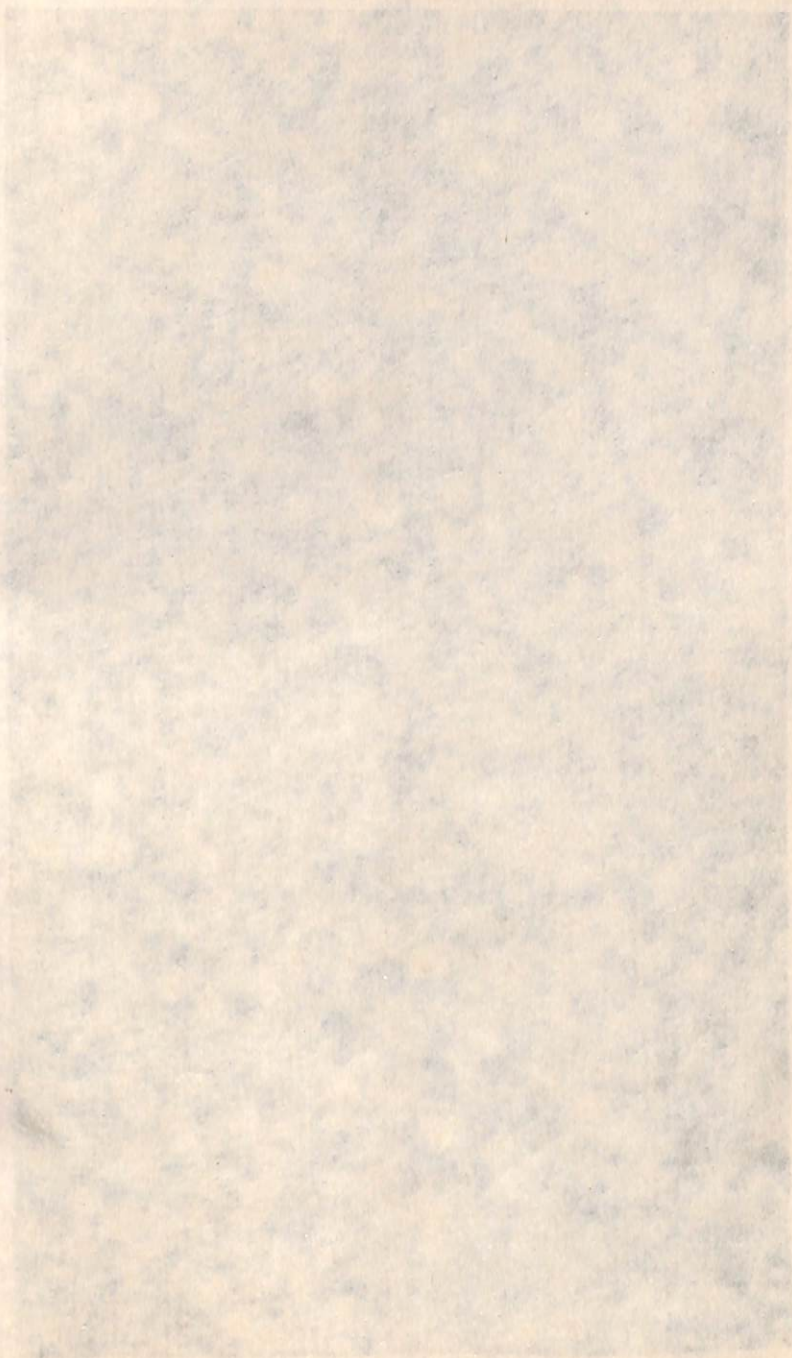
کتابیات

بنگلہ زبان کی کتابیں

۱ — کلیات ٹھاکر وشوا بھارتی ایڈیشن۔ ۲۷ جلدیں۔ ربندر ناتھ ٹھاکر

۲ — گیتانجلی " " سنہ ۱۹۴۸ء " "

۳ — سنچے یتا (انتخاب کلام) سنہ ۱۹۳۱ء " "

۴ — پچی ترا (انتخاب نظم ونثر) سنہ ۱۹۶۱ء " "

۵ — چھویا وشوا بھارتی سنہ ۱۹۶۳ء " "

۶ — بسرجن " سنہ ۱۹۷۹ء " "

۷ — سمرن " سنہ ۱۹۶۱ء " "

۸ — ربندر سمرتی۔ مرتب وشوا ناتھ دے۔ کلکتہ بک ہاؤس سنہ ۱۹۶۱ء

۹ — ہندستان میں قومیت اور بین الاقومیت اور ربندر ناتھ نیپال مجومدار، جولائی ۱۹۶۱ء

۱۰ — ربندر سمرتی مالیہ مرتب سبجیت کمار ناگ۔ کلکتہ سنہ ۱۹۷۱ء

۱۱ — ربندر جیون کتھا۔ پربھات کمار مکھوپادھیائے۔ آنند پبلشرز کلکتہ سنہ ۱۹۸۱ء

۱۲ — حیات ٹھاکر " چار جلدیں۔ وشوا بھارتی پانچواں ایڈیشن سنہ ۱۹۸۵ء

۱۳ — وشوا سبھائے ربندر ناتھ۔ موئتریا دیوی گرنتھم کلکتہ ۶۱-۱۹۶۰ء

۱۴ — سماجی، معاشی اور سیاسی پس منظر میں ٹھاکر کے ادب پر نظر — چار جلدیں۔
ڈاکٹر اسیت کمار دت نیشنل بک ایجنسی۔ کلکتہ، ۱۹۸۳ء

بنگلہ زبان کے رسائل

۱ — ماہنامہ "بھارت ورش" ۱۹۴۱ء

۲ — " "پرباسی" ۱۹۰۷ء، ۱۹۳۱، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء

۳ — " جویا شکتی" ٹھاکر نمبر ۱۹۸۶ء کلکتہ

۴ — " انی کتھی " " " "

۵ — " بسومتی " " " "

۶ — " پنچائتی راج " " "

۷ — ہفت روزہ " پچھم بنگہ " ۱۹۷۸ء

۸ — " " " ۱۹۷۹ء

۹ — " " " " ۱۹۸۰ء

۱۰ — " " " ۱۹۸۱ء

۱۱ — " " " " ۱۹۸۲ء

۱۲ — " " " ۱۹۸۶ء

۱۳ — ہفتہ وار "دیش" کلکتہ پوجا نمبر ۱۹۶۰ء "

۱۴ — سہ ماہی اکیاتان کلکتہ۔ ٹھاکر نمبر ۱۹۸۶ء "

۱۵ — چھ ماہی "سپتا پرنی" کلکتہ ٹھاکر نمبر ۱۹۸۶ء "

اردو تصانیف

۱ — حقیقت تہلکہ پنجاب۔ بابو بینی پرشاد سنگھ بھٹناگر۔ منشور ڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ سنہ اشاعت درج نہیں، قدیم تصنیف ہے۔

۲ — عالمی شاعر یعنی گرودیو ڈاکٹر ربندر ناتھ ٹھاکر کی جیون کہانی۔ ایم۔ عبدالسلام ذکی
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد۔ مئی ۱۹۶۱ء

۳ — ربندر ناتھ ٹیگور۔ وزیر حسن دہلوی۔ ٹیگور صد سالہ کمیٹی، حیدرآباد ۱۹۶۱ء

۴ — گیتانجلی۔ مترجم۔ شرکانت ایم اے، راجپال اینڈ سنس، لاہور۔ سنہ درج نہیں

۵ — شری ربندر ناتھ ٹیگور۔ احسان بی۔ اے، نرائن دت سہگل اینڈ سنس لاہور۔ سنہ درج نہیں

۶ — ٹیگور۔ نادم سیتاپوری، ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ ۱۹۶۱ء

۷ — ٹیگور اور ان کی شاعری۔ مخدوم محی الدین۔ مطبع عہد آفریں حیدرآباد ۱۹۳۵ء

۸ — گیتانجلی (عرض نغمہ)۔ نیاز فتحپوری۔ آزاد بک ڈپو، دہلی۔ مئی ۱۹۱۴ء

۹ — ماہ نو۔ ٹیگور مترجم حامد اللہ افسر میرٹھی۔ میرٹھ ۱۹۲۳ء

۱۰ — گیتانجلی۔ مترجم سید ظہیر عباس۔ رنگ محل، مظفرپور ۱۹۸۲ء

۱۱ — مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات۔ مہدی نواز جنگ، حیدرآباد ۱۹۵۰ء

۱۲ — مغل اور اردو۔ نواب نصیر حسین خیال۔ شائق احمد عثمانی اینڈ سنس کلکتہ ۱۹۳۳ء

۱۳ — اسباب بغاوت ہند۔ سرسید احمد خاں۔ مرتب ڈاکٹر فوق کریمی، دہلی نومبر ۱۹۸۵ء
کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد۔

۱۴ — تاریخ بنگلہ ادب۔ ڈاکٹر سکمار سین۔ ساہتیہ اکاڈمی دہلی، مارچ ۱۹۷۵ء

۱۵ — مختصر تاریخ بنگلہ ادب (حصہ دوم) شانتی رنجن بھٹاچاریہ انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڑھ ۱۹۷۳ء

۱۶ — اقبال، ٹیگور اور نذرل ″ ″ ستمبر ۱۹۷۸ء، کلکتہ

۱۷ — عمر گزشتہ کی کتاب۔ مرزا ظفرالحسن، حسامی بک ڈپو، حیدرآباد مئی ۱۹۷۸ء

۱۸ — اردو نثر میں ادب لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۸۰ء

۱۹ — پریم چند کے خطوط۔ مرتب مدن گوپال

۲۰ — مٹی کا قرض۔ حمایت علی شاعر۔ پاک کتاب گھر، کراچی ۱۹۸۰ء

۲۱ — صورت گران دکن۔ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد ۱۹۷۹ء

۲۲ — میں اور ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی۔ کامریڈ مظفر احمد، مترجم سالک لکھنوی
نیشنل بک ایجنسی، کلکتہ ۷۳

اردو اخبارات اور رسائل

۱ — روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۳ء
۲ — پندرہ روزہ مغربی بنگال کلکتہ، ربندر ناتھ نمبر۔ ۱۹۷۵ء، ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۶ء
۳ — ماہنامہ "کتاب نما" دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء
۴ — " نگار پاکستان، کراچی، نیاز نمبر حصہ اول ۱۹۶۳ء
۵ — " نیا دور شمارہ نمبر ۴۳-۴۴
۶ — " " لکھنؤ۔ منشی دیا نرائن نگم نمبر ۱۹۸۲ء
۷ — " خاور ڈھاکا جون ۱۹۵۳ء
۸ — " ہما ڈائجسٹ، دہلی اقبال صدی نمبر ۱۹۷۷ء
۹ — سہ ماہی "گفتگو" مدیر سردار جعفری جلد ۱، ۱۹۶۷ء
۱۰ — " اردو، اورنگ آباد، دکن۔ اپریل ۱۹۲۵ء

انگریزی کتابیں اور رسائل

۱ — کلکتہ منسپل گزٹ، ربندر ناتھ ٹھاکر خاص شمارہ، بار دوم مئی ۱۹۸۶ء
۲ — پندرہ روزہ "ویسٹ بنگال" کلکتہ کے خاص شمارے ٹھاکر نمبر برائے ۱۹۷۵ء
۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۶ء۔